اُردو نامہ

ترقیٔ اُردو بورڈ کا باتصویر مجلّہ

URDU DEVELOPMENT BOARD

چودھواں شمارہ

مع
اردو لغت
قسط نمبر ۸

اُردُو نامہ

شمارہ ۱۴ - اکتوبر تا دسمبر ۱۹۶۳ع

مضامین

۱ - افتتاحیہ — ادارہ ۲
۲ - غزل — ادیب سہارنپوری مرحوم ۵
۳ - غزل — نظر حیدرآبادی مرحوم ۶
۴ - اردو کی بنیادی اور ذیلی آوازیں — ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ۷
۵ - سکون اول کا مسئلہ — سہیل بخاری ۴۴
۶ - مولوی محمد شفیع مرحوم — سید ہاشمی فرید آبادی ۵۰
۷ - لغات الاضداد — محمد اقبال سلمان ۵۳
۸ - گل کرسٹ اور اس کا عہد — محمد عتیق صدیقی ۵۷
۹ - زمیں کا براق — جوش ملیح آبادی ۶۷

نادرات

۱۰ - اردو کی ایک نادر مثنوی — شریف الحسن ۲۶
۱۱ - رسالۂ حسن، حیدرآباد — نصیر الدین ہاشمی ۳۷

شعبۂ مطبوعات

۱۲ - اردو کی پہلی کتاب — ممتاز حسن ۶۹
۱۳ بچوں کے لئے موزوں کتابوں کی ضرورت — بیگم شائستہ اکرام اللہ ۷۳

شعبۂ لغت

۱۴ - اشتقاقیات — ڈاکٹر شوکت سبزواری ۷۶
۱۵ - اردو لغت 'مجمل' ایڈیشن، قسط نمبر (۸) — ادارہ ۱۲۹ تا ۱۴۶
۱۶ - مراسلات — جلیل قدوائی ۷۹
۱۷ - تبصرہ — خ - ح - ش ۸۰

سرورق: مولوی محمد شفیع مرحوم (ملاحظہ ہو مضمون صفحہ ۵۰)

سید یوسف بخاری، مینیجر ''اردو نامہ'' نے ترقیٔ اردو بورڈ کی جانب سے شائع کیا۔

ترقیٔ اردو بورڈ کا سہ ماہی مجلہ

ترقی اردو بورڈ
URDU DEVELOPMENT BOARD

نگراں

جناب ممتاز حسن

ادارۂ تحریر

جوش ملیح آبادی — شان الحق حقی

خواجہ حمید الدین شاہد

ترقیِ اُردو بورڈ، کراچی

ٹیلیفون نمبر: ۴۲۱۶۳

چندہ سالانہ: چار روپے ★ فی پرچہ: ایک روپیہ

اردو منزل، جمشید روڈ کراچی-۵
(مغربی پاکستان)

مطبوعہ ایسٹ پریس، کراچی

چینی ادیب
یان یون اور وین چنیہ
ترقیٔ اردو بورڈ میں
جناب ممتاز حسن اور
شان الحق حقی
کے ساتھ

دائیں سے بائیں : سید حسام الدین راشدی ، ڈاکٹر شوکت سبزواری ، شان الحق حقی ، پروفیسر حمید احمد خاں، ممتاز حسن ، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ، رازق الخیری صاحبان بورڈ کے دفتر میں

اردو نامہ

اردو نامہ شمارہ ۱۲ و ۱۳ میں جس انعامی مقابلے کا اعلان کیا گیا تھا، اس کے جواب میں بہت سے مسودات موصول ہوئے۔ حملہ حضرات کو ان کے مضامین کی رسید فوراً فوراً بھیج دی گئی تھی۔ افسوس ہے کہ نتائج کے اعلان میں تاخیر واقع ہوئی۔ پہلے تو مسودات وصول ہونے کی آخری تاریخ بڑھانی پڑی، کیونکہ اس کی بابت بہت سے خطوط موصول ہوئے تھے۔ چونکہ پانچ موضوعات پر پوری پوری کتابوں کے مسودات طلب کئے گئے تھے اس لئے فیصلہ کیا گیا کہ تاریخ ۳۰۔ جون کی بجائے ۳۱۔ اگست ۱۹۶۳ء تک بڑھا دی جائے۔

اس کے بعد اس تمام ذخیرے کو جانچنے کی مہم درپیش ہوئی۔ اس کے لئے پاکستان رائٹرز گلڈ کے مشورے سے حسب ذیل کمیٹی نامزد کردی گئی:

جناب میاں بشیر احمد بورڈ کے دفتر میں

دائیں سے بائیں: ڈاکٹر سبزواری، میاں صاحب، جناب پیر حسام الدین راشدی اور حقی

بیگم شائستہ اکرام اللہ صاحبہ
(نائب صدر ترقیٔ اردو بورڈ)
جناب جلیل قدوائی

جناب ابن انشا
بیگم هاجره مسرور
جناب رفیق خاور
شان‌الحق حقی
بیگم اکرام اللہ صاحبہ کو اس عرصے

بورڈ کے ایک جلسے میں: (دائیں سے بائیں) جناب صدر ممتاز حسن ، حقی، پروفیسر حمید احمد خاں ، ڈاکٹر شہید اللہ اور جناب رازق الخیری

میں جو خانگی سانحات پیش آئے ان سے سب واقف ہیں ۔ یہ ان کے خانگی سانحات کے علاوہ ہمارے قومی سانحات بھی تھے ۔ بیگم صاحبہ نے ان کا مقابلہ بڑی ہمت و استقلال سے کیا ہے ۔ انہوں نے ایسے کڑے وقت میں بھی اپنی دوسری ذمہ داریوں کے ساتھ اس ذمہ داری کو اپنے جذبۂ خدمت کے باعث قبول کرلیا اور بڑی ہمت سے نباھا، بہت سے مسودات کے مطالعے پر وقت صرف کیا ۔ مگر یہ بھی ان کا احساس ذمہ داری تھا کہ فیصلے میں شریک نہ ہوئیں ۔ ان کو اس کی مہلت نہ مل سکی کہ منصفی کا حق ادا کرسکتیں ۔ لندن کا سفر اختیار

کرنا تھا اور یہاں فیصلے میں زیادہ تعویق مناسب نہ تھی۔

اس بات کا اعتراف واجب ہے کہ عورتوں اور بچوں کے ادب کی اشاعت کے سلسلے میں اس ادارے کی سرگرمیاں بالخصوص بیگم اکرام اللہ صاحبہ کے اصرار اور کوشش کی مرہون منت ہیں۔ وہ اسے اردو کی ترقی کا ایک بنیادی مسئلہ خیال کرتی ہیں کہ عورتوں اور بچوں کو اردو زبان سے بیگانہ نہ ہونے دیا جائے۔ ہمارا وہ کلاسکی ادب جو خاص طور پر ہمارے بچوں اور ان کی ماؤں کے لئے لکھا گیا تھا، ایک ثقافتی ورثہ ہے جو ان تک ضرور پہنچ جانا چاہیے۔

آخر کمیٹی کے باقی ماندہ ارکان ہی نے مسودات کے معائنے کا کام انجام دیا۔ تین انعامات کے فیصلے ہو چکے ہیں جو ذیل میں درج کئے جارہے ہیں۔ افسوس ہے کہ چوتھے اور پانچویں موضوع (یعنی طویل اور مختصر کہانیوں) پر انعامات کا فیصلہ اس پرچے کے چھپنے کے وقت تک نہ ہوسکا۔ اس کے لئے کمیٹی کی ایک نشست عنقریب ہونے والی ہے۔ اس کے بعد اسے بہت جلد شائع کردیا جائے گا۔

ہم مقابلے میں شریک ہونے والے حضرات کے نہایت شکر گزار ہیں کہ انہوں نے ہماری دعوت پر اتنے اچھے اور اتنے بہت سے مسودے مرتب کردئے۔ کامیاب حضرات کو بہت بہت مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ ان کے مسودات واقعی قابل تعریف اور لائق انتخاب تھے۔ ان کے علاوہ اور بھی اچھے اچھے مسودے ہیں، لیکن افسوس ہے کہ انعامات محدود تھے۔ غالباً یہ اچھے اچھے مسودے بیکار نہ جائیں گے، بلکہ سامنے آئیں گے اور قبول عام پائیں گے جو سب سے بڑا انعام ہے۔

ش-ح-ح

بچوں کے ادب پر انعامات کا فیصلہ

ا۔ موضوع : سائنس کے دلچسپ تجربات

مصنفہ: نکہت سلطانہ صاحبہ۔ انعام مبلغ پانچ سو روپے نقد

ب۔ موضوع : سیر پاکستان

مصنفہ: رضیہ فصیح احمد صاحبہ۔ انعام مبلغ پانچ سو روپے نقد

ج۔ موضوع : ایک تمثیل

تصنیف: "ایک ننھا چور" مصنف: انور عنایت اللہ صاحب۔ انعام مبلغ پانچ سو روپے نقد

چوتھے اور پانچویں انعام کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔ کامیاب مصنفین کو انعامات کی رقمیں جلد ادا کردی جائیں گی۔

شان الحق حقی
رکن و معتمد (اعزازی) ترقی اردو بورڈ، کراچی ۵

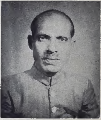

ادیب سہارنپوری مرحوم

کسے خبر تھی کہ اردو کی محفل شاعری اس قدر جلد ادیب کی دل‌نشیں آواز اور شائستہ و شیریں غزل سے محروم ہونے والی ہے۔ مرحوم نے کراچی میں ۱۶- جولائی ۶۳ء کو مختصر علالت کے بعد انتقال کیا۔ ان کا نام عبدالرؤف تھا مگر اپنے قدردانوں میں ادیب سہارنپوری کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔ نظر حیدرآبادی اور ادیب کے بغیر اب نہ صرف کراچی بلکہ دور دور کی شاعرانہ محفلیں سونی نظر آئیں گی۔ ''اردو نامہ'' اس غم میں مرحوم کے پسماندگان کا شریک ہے۔

مقابل میں ان کی ایک غزل ہدیۂ ناظرین کی جاتی ہے۔

ش - ح - ح

غزل

ہو تعلق جو کسی سے تو بہت ہے کم بھی
لطف دیتا ہے، محبت میں تو یارو غم بھی

کون پوچھے گا بھلا حشر میں تم کو اے شیخ
قابل عفو تو سمجھے نہ گئے آدم بھی

وہ ازل ہو کہ ابد، کوچۂ جاناں کہ بہشت
مجھ کو تسکین نہ بخشے گا، کوئی عالم بھی

عمر اپنی بھی اندھیروں ھی سے لڑتے گزری
کم نہیں چاند ستاروں سے پریشاں ہم بھی

موت آوارہ و بیتاب ہے خود جس کے لئے
زندگی میں وہ سکوں ڈھونڈ رہے ہیں ہم بھی

ہم نشینی بھی بڑی شے ہے حسینوں کی ادیب
ہو جو پھولوں میں تو لگتی ہے بھلی شبنم بھی

نظر حیدرآبادی مرحوم

ادیب سہارنپوری کا غم تازہ تھا کہ اردو کے ایک اور مقبول اور خوش کلام شاعر، نظر حیدرآبادی نے ۲۸ - اگست ۱۹۶۳ء کی شب کو صرف (۴۴) سال کی عمر میں ناگہاں انتقال کیا، اور اپنے پس ماندگان کے ساتھ بے شمار احباب اور قدردانوں کو غم‌زدہ کر گئے۔ اس ادارے کے ارکان کے ساتھ مرحوم کے خصوصی تعلقات تھے۔ ہمارے دل پر ان کی شاعری اور شخصیت دونوں کا نقش بہت گہرا اور اسی نسبت سے ان کا داغ بھی بہت روشن ہے -

مقابل میں مرحوم کی ایک غیر مطبوعہ غزل ہدیہ ناظرین کی جاتی ہے :

ش - ح - ح

غزل

جو من اجال دیں، وہ اندھیرے کہاں گئے
وہ رت جگے وہ رین بسیرے کہاں گئے

آنکھوں میں کھلنے والے وہ میخانے کیا ہوئے
پھولوں میں کھلنے والے سویرے کہاں گئے

مہ پیکروں کے شیوہ شب خوں کو کیا ہوا
عقل و دل و نظر کے لٹیرے کہاں گئے

وہ ساحلوں کی شام صبا لے اڑی کدھر
وہ گیسوؤں کے مست پھریرے کہاں گئے

کیوں مدتوں سے حسن کی کلیاں اداس ہیں
یاران خوش خرام کے پھیرے کہاں گئے

ماضی کی بات، وقت سے کرنے لگے نظر
ناگن سے پوچھتے ہو سپیرے کہاں گئے

اُردو کی بُنیادی اور ذیلی آوازیں (۱)

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

آواز ہماری روز مرہ زندگی کا نہایت اہم عنصر ہے ۔ اس کے بغیر سماجی تعلقات کا تصور ھی نہیں کیا جاسکتا ۔ انسانی آواز کے تنوع پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسان کے اعضائے صوت سیکڑوں قسم کی آوازیں پیدا کر سکتے ھیں ۔ لیکن کوئی ایک زبان ان سب آوازوں کو استعمال نہیں کرتی۔ ھر زبان اپنے مزاج کے مطابق ان میں سے چند آوازوں کو لے لیتی ھے ۔ پھر بھی کسی زبان کا تجزیہ کرتے ہوئے پہلی دقت آوازوں کی کثرت ھی کی وجہ سے پیش آتی ھے ۔ وہ یوں کہ کوئی ایک انسانی آواز دوسری آواز سے سو فی صدی مطابقت نہیں رکھتی۔ مثال کے طور پر سنت اور سنگ کو لیجئے ۔ ان الفاظ میں (ن) کی آواز مختلف سنائی دیتی ھے ۔ چنانچہ صوتیاتی تجزیئے میں پہلا مسئلہ یہی ھے کہ اس قسم کے نون کو دو آوازیں قرار دیا جائے یا ایک ۔ لسانیات کے ماھرین نے اس کا یہ حل نکالا ھے کہ جہاں باھمی صوتی فرق معنی کی تفریق میں مدد دے ، وھاں آوازوں کو الگ الگ فونیم (Phoneme) یعنی بنیادی آواز تسلیم کیا جائے ، اور اگر صوتی فرق سے معنی تبدیل نہ ہوتے ہوں تو ان آوازوں کو ایک ھی فونیم کی ذیلی اصوات (Allophones) قرار دیا جائے ۔

زبان میں آواز کا بنیادی مصرف یہ ھے کہ وہ ایک معنی کو دوسرے سے ممیز کرنے میں مدد دے ۔ لیکن کوئی بھی زبان اپنی تمام آوازوں سے یہ خدمت نہیں لیتی۔ چنانچہ صرف وھی آوازیں جو معنوی طور پر ممتاز ہوں " فونیم " کہلاتی ھیں ۔ مثال کے طور پر

(۱) اردو میں لسانیاتی مسائل پر قلم اٹھانے ہوئے سب سے زیادہ دقت اصطلاحات کی وجہ سے پیش آتی ھے ۔ راقم الحروف کے نزدیک اصطلاحات سازی میں بنیادی اھمیت الفاظ کے قرینے کے علاوہ ان کے چلن کی ھے ۔ اصطلاحوں میں محض معیاری پسند کی ترازو سے کام نہیں چلتا ، بلکہ فیصلہ بہت کچھ رواج اور چلن پر چھوڑنا پڑتا ھے ۔ چنانچہ زیر نظر مقالے میں اصطلاحیں صرف وھی استعمال کی گئی ھیں جو اردو میں کچھ کچھ رواج پا چکی ھیں یا عام فہم ھیں ۔ جہاں ضروری سمجھا گیا ھے ، ان کے انگریزی مترادفات بھی ساتھ ساتھ درج کردئے گئے ھیں۔

چال اور جال میں دوسری اور تیسری آواز الف اور ل مشترک ہیں ، لیکن پہلی آواز ایک لفظ میں چ ہے اور دوسرے میں ج - مخرج کے اعتبار سے چ اور ج دونوں تالوئی آوازیں ہیں ، فرق صرف یہ ہے کہ ایک مسموع (Voiced) ہے اور دوسری غیرمسموع (Voiceless) لیکن یہ صوتی فرق چونکہ معنی کی تفریق میں مدد دیتا ہے ، اس لئے چ اور ج کو دو مختلف اور متضاد بنیادی آوازیں یعنی فونیم تسلیم کیا جائے گا - یہی بات پر اور پار میں دیکھی جاسکتی ہے - پہلے لفظ میں مصوّتہ زبر (ә) ہے اور دوسرے میں الف (a) لیکن مصوتوں کے اس فرق سے معنی بدل گئے ہیں - اس لئے اردو میں زبر اور الف الگ الگ فونیم قرار پائے - اس کے برعکس اگر لفظ زحمت میں (ز) کی آواز کو یا لفظ وحدت میں (و) کی آواز کو امالہ دار زبر کے بجائے زبر سے پڑھیں تو معنی میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا - پس اردو میں امالہ دار زبر اور زبر کی آوازیں آپس میں اس طرح متضاد نہیں جس طرح زبر اور الف ہیں - چنانچہ زبر اور امالہ دار زبر کو الگ الگ فونیم تسلیم نہیں کیا جائے گا بلکہ یہ دونوں ایک ہی فونیم یعنی زبر کی دو ذیلی اصوات (Allophones) قرار پائیں گی-

ذیلی اصوات زیادہ تر مخصوص صوتی ماحول میں استعمال ہوتی ہیں یعنی یا تو کسی مخصوص صوت سے پہلے آئیں گی یا بعد میں، یا پھر لفظ کے شروع میں آئیں گی، یا درمیان میں یا آخر میں - مثال کے طور پر اردو میں امالہ دار زبر صرف ہائے ہوز یا حائے حطی سے پہلے یا بعد میں آتا ہے ، باقی تمام آوازوں کے ساتھ زبر کی آواز میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی- اس کے برعکس فونیم ایک ہی صوتی ماحول میں واقع ہوسکتی ہیں اور بنیادی بات یہ ہے کہ وہ معنی کے فرق میں مدد دیتی ہیں - رہا اردو کی ان آوازوں کا معاملہ جن کے لئے ایک سے زیادہ علامتیں ہیں، مثلاً س ، ث ، ص، یا ز ، ذ ، ظ ، ض، ان کے بارے میں اتنی بات خاطر نشان رہنی چاہئے کہ اردو میں ان سب علامتوں کی اپنی اپنی الگ آواز نہیں - اردو بول چال میں اگر لفظ ثابت کو سابت یا صابت بولا جائے تو معنی میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا ، یا اگر لفظ ساز کو ساذ ، ساظ یا ساض کہا جائے تو بھی معنی وہی رہتے ہیں - پس اردو میں ذ ، ظ اور ض (ز) کی آواز کو اور ث اور ص (س) کی آواز کو ظاہر کرنے کے لئے مختلف علامتیں ہیں- یہ علامتیں چونکہ صوتی اعتبار سے ایک ہیں اور آپس میں متضاد نہیں، اس لئے انہیں فونیم کا درجہ نہیں دیا جاسکتا - واقعہ یہ ہے کہ یہ علامتیں ہمارے رسم الخط کی بوالعجبیوں کے سوا کچھ نہیں ، یعنی یہ محض علامتیں ہیں اور ان کی اپنی اپنی آواز نہیں-

غرض فونیم زبان کی وہ بنیادی صوتیاتی اکائیاں ہیں جو معنی کا فرق قائم رکھنے میں مدد دیتی ہیں اور زبان کی تمام دوسری

اصوات سے متصادم ہوتی ہیں - اس نظریے کی مدد سے کسی بھی زبان میں آوازوں کی پریشان کن کثرت کی درجہ بندی سائنسی صحت سے اس انداز پر کی جا سکتی ہے کہ نہ صرف آوازوں کا ظاہری انتشار، گنتی کی چند منظم اکائیوں کی صورت اختیار کرلے، بلکہ مختلف اصوات کے باہمی رشتوں کا بھی پتہ چل جائے- زبان میں اصوات کی تعداد خواہ کچھ ہو، اس کی فونیم ہمیشہ مقرر اور محدود ہوں گی اور ان کی تعداد زبان کی کل اصوات کے مقابلے میں کم ہوگی -

زبان کے جن دو مماثل الفاظ میں صرف ایک ایک آواز کے اختلاف کی وجہ سے معنی تبدیل ہوجائیں، انہیں لسانیات کی اصطلاح میں اقلی جوڑا (Minimal Pair) کہتے ہیں - اوپر کی سطروں میں دو لفظ چال اور جال پیش کئے گئے تھے- یہ دراصل اقلی جوڑا ہی ہیں - زبان کے صوتیاتی تجزیے کی بنیاد الفاظ کے انہیں اقلی جوڑوں پر رکھی جاتی ہے - جن آوازوں کے اقلی جوڑے فراہم ہوجائیں، انہیں زبان میں فونیم یعنی بنیادی آوازوں کی حیثیت حاصل ہوجاتی ہے - جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے، فونیم اس بنیادی آواز کو کہتے ہیں جس سے زبان میں معنی کا فرق قائم رکھنے میں مدد ملے - اقلی جوڑے میں چونکہ دو مختلف آوازیں ایک جیسے صوتی ماحول میں واقع ہوتی ہیں، یعنی سوائے ایک آواز کے باقی سب آوازیں اور ان کی ترتیب ایک جیسی ہوتی ہے اور محض ایک آواز کی بدولت لفظ کے معنی تبدیل ہوجاتے ہیں، اس لئے اس مخصوص آواز کو بنیادی آواز یعنی فونیم کا درجہ دیا جاتا ہے -

مصمتی فونیم | سب سے پہلے اردو کی مصمتی آوازوں کے مندرجہ ذیل مسلسل اور مفرد اقلی جوڑے ملاحظہ ہوں:

I	(۱)	پ	پال
	(۲)	ب	بال
	(۳)	ت	تال
	(۴)	د	دال
	(۵)	ٹ	ٹال
	(۶)	ڈ	ڈال
	(۷)	چ	چال
	(۸)	ج	جال
	(۹)	ک	کال
	(۱۰)	گ	گال
	(۱۱)	ق	قال
II	(۱۲)	م	مال
	(۱۳)	ن (فاصل)	نال
	(۱۴)	ف	فال
	(۱۵)	س	سال
	(۱۶)	ز	زال

	(۱۷)	ش		شال
	(۱۸)	خ		خال
	(۱۹)	غ		غال(۱)
	(۲۰)	ہ		ھال
	(۲۱)	ل		لال
	(۲۲)	ر		رال
III	(۲۳)	ڑ		احڑ
		ڈ		احڈ
IV	(۲۴)	ن	(واصل)	ڈنکا
		ن	(فاصل)	منکا

اوپر کے گوشوارے میں اردو کی ۲۴ مصمتی بنیادی آوازوں کا معنوی امتیاز واضح کیا گیا ہے۔ ان جوڑوں سے ظاہر ہے کہ مندرجہ بالا ۲۴ آوازوں میں سے ہر آواز معنی کے فرق میں مدد دیتی ہے۔ اس لئے فونم کا درجہ رکھتی ہے۔ پہلی اور دوسری شق میں مسلسل اقلی جوڑے پیش کئے گئے ہیں جن میں ہر آواز باقی تمام آوازوں سے تضاد کی حالت میں ہے۔ ڑ چونکہ کسی لفظ کے سروع میں نہیں آتا، اس لئے تیسری شق میں اس کا مفرد اقلی جوڑا ڈ کے ساتھ آخری حالت میں پیش کیا گیا ہے۔ چوتھی شق میں وصلی نون کا مماثل جوڑا (Analogous Pair) فصلی نون سے پیش کرکے اس آواز کی آزادانہ حیثیت کو ثابت کیا گیا ہے۔ نیچے اردو کے ان ۲۴ مصمتی فونیم کے بعض خصائص کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی ذیلی آوازوں (Allophones) کی تفصیل پش کی جای ہے۔

۵، ح اردو میں ہ کی تین ذیلی اصوات قرار دی جاسکتی ہیں:

۱- ھائے مخلوط کامل
۲- ھائے مخلوط جزوی
۳- ھائے ملفوطی

• اردو میں ھائے مخلوط کامل، بندشی اور ایفرکیٹ آوازوں میں ملتی ہے، یہ تعداد میں دس ہیں: پھ بھ، تھ دھ، ٹھ ڈھ، چھ جھ اور کھ گھ۔ یہ خالص ہند آریائی اصوات ہیں اور بندشی آوازوں میں مکمل سٹ کی حیثیت سے صرف ہندوستانی زبانوں میں ملتی ہیں۔ ہندی کی طرح اردو نے بھی انھیں تمام و کمال محفوظ رکھا ہے۔ ان کے باہمی تضاد کے لئے مندرجہ ذیل اقلی جوڑے ملاحظہ ہوں:

پھ	پھوَل	بھ	بھوَل
تھ	تھم	دھ	دھم
ٹھ	ٹھور	ڈھ	ڈھور
چھ	چھل	جھ	جھل
کھ	کھول	گھ	گھول

اردو رسم الخط میں ھکار آوازوں کو چونکہ سادہ آوازوں کی علامت میں ھائے دوچشمی کے اضافے سے لکھا جاتا ہے: ب اور ھ 'بھ' د اور

(۱) بہ معنی گراں بار، بھاری، بوجھل (اردو میں لفظ "عالی" مستعمل ہے)

ھ 'دھ' اس لئے انھیں مرکب آوازیں سمجھنے کی غلط فہمی افسوسناک حد تک عام ہے ، حالانکہ یہ اعضائے صوت کی ایک ہی جنبش سے ادا ہوتی ہیں اور ان کی حیثیت مرکب آوازوں کی نہیں بلکہ مفرد آوازوں کی ہے ۔ دیوناگری رسم الخط میں ان کی مفرد حیثیت تسلیم کی گئی ہے اور ان کے لئے الگ سے علامات مقرر ہیں ۔ اردو میں ایسا نہیں ہے ۔

اردو میں ہ کی آواز بعض حالتوں میں نرما دی جاتی ہے ۔ وسطی یا آخری حالت میں ہ بعض اوقات مصوتے میں بدل جاتی ہے اور معنی میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا مثلاً :

وسطی حالت میں :

تمھیں : تمیں
انھیں : انیں
ننھا : ننا
وھاں : واں
یہاں : یاں

آخری حالت میں :

بہانہ : بہانا
جذبہ : جذبا
نشانہ : نشانا
زمانہ : زمانا

لیکن جہاں تک اردو کی دس بندشی اور ایفرکیٹ ھکار آوازوں کا تعلق ہے، یہ مستقل آوازیں ہیں اور اگر انھیں بولتے ہوئے ہ کی کیفیت کو نرما دیا جائے یا ختم کردیا جائے تو معنی میں فرق پیدا ہوجائے گا :

۱- پھٹ پٹ (پھ ، پ)
۲- بھاری باری (بھ ، ب)
۳- تھک تک (تھ ، ت)
۴- دھم دم (دھ ، د)
۵- ٹھاٹھ ٹاٹ (ٹھ ، ٹ)
۶- ڈھال ڈال (ڈھ ، ڈ)
۷- چھپ چپ (چھ ، چ)
۸- جھاڑا جاڑا (جھ ، ج)
۹- کھیل کیل (کھ ، ک)
۱۰- گھن گن (گھ ، گ)

غرض یہ دس ھکار آوازیں اردو کی منفرد اور مستقل آوازیں ہیں اور معنی کو ممیز کرنے میں مدد دیتی ہیں ۔ چنانچہ ان سب کو فونیم تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ لیکن قباحت یہ ہے کہ اس سے اردو فونیم کی تعداد بہت بڑھ جائے گی ۔ اگر اسے سائنسی طور پر کم کیا جاسکے تو مستحسن ہے ۔ اتنی بات واضح ہے کہ نوعیت کے اعتبار سے ان دس آوازوں میں ھکار کیفیت قدر مشترک کا درجہ رکھتی ہے ۔ اس ھکار کیفیت کے بغیر یہ دس کی دس آوازیں سادہ بندشی اور ایفرکیٹ آوازیں ہیں ، جنھیں ہم اس سے پہلے فونیم تسلیم کر چکے ہیں ۔ ان آوازوں اور سادہ آوازوں میں معنی کا جو فرق لازم آتا ہے، وہ بھی محض اسی ھکار کیفیت کی بدولت ہے ۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ دس ھکار آوازوں کو الگ‌الگ فونیم تسلیم کرنے کے بجائے صرف ھکار کیفیت کو بنیادی اہمیت دی جائے ۔ لیکن دقت یہ ہے کہ اس ھکار

کیفیت کو بھی الگ فونیم نہیں مانا جاسکتا کیونکہ یہ صرف اس صوتی ماحول میں ملتی ہے ، جہاں ہائے مخلوط جزوی یا ہائے ملفوظی نہیں آسکتیں۔ گویا تینوں آوازوں کے درمیان سمجھوتا ہے کہ ایک کے صوتی ماحول میں دوسری استعمال نہیں ہوگی۔ لسانیات میں اس صورت حال کو آوازوں کا تکملی بٹوارہ (Complimentary Distribution) کہتے ہیں ، یعنی آوازیں اس طرح استعمال ہوں کہ ایک کی جگہ پر دوسری نہ آسکے۔ ذیل میں ان تینوں اصوات کے صوتی ماحول کی نشان دہی کی جاتی ہے :

۱ - ہائے مخلوط کامل - یہ بندشی اور ایفرکیٹ آوازوں کے ساتھ ضم کر کے بولی جاتی ہے اور دونوں آوازیں ایک ہی صوتی رکن کا جز ہوتی ہیں۔ مثلاً پھول ، گمبھیر ، گانٹھ ۔

۲ - ہائے مخلوط جزوی - یہ ل ، م ، ن ، ر ، ڑ اور عوامی بول چال میں ی ، و ، اور ز کے ساتھ ضم کر کے بولی جاتی ہے اور دونوں آوازیں ایک ہی صوتی رکن کا جز ہوتی ہیں ، مثلاً مہارا ، تمھیں ، انھیں ، بڑھ ، پڑھ ، یہاں ، وہاں وغیرہ۔ اس میں شک نہیں کہ ان الفاظ میں ہ کی آواز مصمتے کے فوراً بعد جڑواں حالت میں آتی ہے اورکسی حدتک پہلی آواز میں ضم ہو جاتی ہے ، لیکن اس حدتک نہیں جیساکہ ہکار آوازوں بھ بھ وغیرہ میں ہوتا ہے۔ وہاں انضمام کامل ہے اور یہاں جزوی ۔

۳ - ہائے ملفوظی- یہ بقیہ موقعوں پر آتی ہے اور اگر مندرجہٴ بالا آوازوں میں سے کسی کے بعد آئے تو یا اس رکن کا جز نہیں ہوتی یا اس سے پہلے کوئی مصوتہ ہوتا ہے ، مثلاً بہت ، محبت ، گناہ ، ہم ، کہہ ، بہتر ، چہار ، گہر ، اظہر ۔

اس سے ثابت ہوا کہ مندرجہٴ بالا تینوں اصوات ہ کی ذیلی اصوات ہیں۔

اردو کے ابتدائی قاعدوں میں پھ بھ وغیرہ ہکار آوازوں کو سادہ آوازوں پر ہائے دو چشمی کے اضافے کی حیثیت سے سمجھایا اور پڑھایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ہر اردو کا طالب علم ڈھال، کھال وغیرہ الفاظ کو چار آوازوں یعنی ڈ ، ھ ، ا اور ل یا ک ، ھ ، ا اور ل کا مجموعہ سمجھتا ہے جو غلط ہے۔ ڈھال میں 'ڈھ' اور کھال میں 'کھ' دو آوازوں سے مرکب نہیں بلکہ 'ڈھ' اور 'کھ' مفرد آوازیں ہیں۔ اس سلسلے میں اردو املا کی بے اصولی بھی کم دلچسپ نہیں۔ سادہ آوازوں کے بعد ہائے دوچشمی یا ہائے ہوز کے استعمال میں تخصص نہیں کی جاتی یعنی ہائے مخلوط کامل اور ہائے ملفوظی میں کوئی تفریق روا نہیں رکھی جاتی اور اس طرح مبتدی کی گمراہی کا پورا سامان کر دیا جاتا ہے ، مثلاً دہلی کو دھلی دہل کو دھل، بہے کو بھے، ہمیشہ کو ھمیشہ اور ہمیں کو ھمیں لکھنے کا عام رواج ہے۔ اس میں کچھ معذوریاں نسخ ٹائپ کی بھی ہیں۔

لیکن خط نستعلیق میں اس کا کیا جواز ہے ؟ اس میں اگر ہائے دوچشمی لفظ کے شروع میں لکھی گئی یا کسی بندشی آواز کے بعد نہیں تو خیر ، ورنہ اس بے اصولی کو اصول بناتے ہوئے اگر دھر کو دھر یا بھر کو بھر یا بھار کو بھار یا اس کے برعکس لکھا جائے تو مبتدی کو جس دقت کا سامنا ہوگا، وہ ظاہر ہے ۔ چنانچہ ضروری ہے کہ ہائے دوچشمی کا استعمال ہائے مخلوط کامل اور ہائے مخلوط جزوی سے مخصوص کردیا جائے ۔

ک، ق | ک کی آواز عربی فارسی اور ہند آریائی زبانوں میں مشترک ہے ، جب کہ ق خالص عربی صوت ہے اور سوائے اردو کے کسی دوسری ہندوستانی زبان میں استعمال نہیں ہوتی ، چنانچہ اردو میں بعض ماہر لسانیات ق اور ک کو ایک فونیم تسلیم کرتے ہیں ۔ دراصل مخرج کے اعتبار سے یہ دو مختلف اصوات ہیں ۔ ک غشائی (Velar) آواز ہے اور ق کوّے یا لہات سے ادا ہونے والی لہاتی (Uvular) آواز ہے ۔ لیکن چونکہ اردو بولنے والوں کی ایک بڑی تعداد لہاتی ق کے تلفظ پر قادر نہیں اور اسے غشائی ک میں بدل دیتی ہے ، اس لئے ق کو ک کی ذیلی صوت ماننے پر زور دیا جاتا ہے ۔ لیکن ذیلی صوت تسلیم کرنے کی بنیادی شرط یہ ہے کہ آوازوں کے باہم تبادلے سے معنی متاثر نہ ہوں ۔ ق اور ک کا معاملہ اس کے برعکس ہے ۔ اردو میں الفاظ کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جن میں اگر بجائے ق کے ک یا اس کے برعکس بولا جائے تو معنی تبدیل ہوجاتے ہیں ۔ مثلاً

قال	کال
قمر	کمر
قلی	کُلی
قاری	کاری
قے	کَے
قاش	کاش
قاصد	کاسد
قد	کَد
قرنا	کرنا
قصر	کسر
قضا	کذا
عقل	اکل
حق	حک

ان مثالوں کے پیش نظر ق کو ک کی ذیلی صوت نہیں مانا جاسکتا بلکہ اسے بھی اردو کی بنیادی آواز یعنی فونیم تسلیم کرنا پڑے گا ۔

ت، ط | یہ دونوں صوتی اعتبار سے اردو میں ایک آواز ہیں۔ عربی میں ط غشائی صوت ہے اور ت دندانی۔ اردو کے جن مستعار الفاظ میں ط آتا ہے، ان کا تلفظ بھی چونکہ دندانی طریقے پر ہوتا ہے ، اس لئے اردو میں ط کی اپنی کوئی صوتی حیثیت نہیں اور فقط ت ہی اردو کی بنیادی آواز ہے ۔ چنانچہ اوپر کے گوشوارے میں صرف ت کو شامل کیا گیا ہے ، ط کو

نہیں۔ ظ نہ اردو کی فونیم ہے نہ ذیلی صوت۔

م، ن| اردو میں نون اپنے بعد آنے والے مصمتوں کے ساتھ ہم مخرج ہوسکتا ہے، اس لئے نون کی ایک نہیں، دو بنیادی آوازیں ہیں: وصلی نون اور فصلی نون، یعنی مکمل اعلان کا نون اور جزوی اعلان کا نون۔ وصلی اعلان (Homorganic N) مصوتے کے بعد اور مصمتے سے پہلے ہم مخرج طور پر ادا ہوتا ہے، مثلاً: کَنج، تُند، رَنج، پِنڈ، انڈا۔ پہلے دو الفاظ میں ن سے پہلے مصوتہ ضمہ ہے، تیسرے اور چوتھے میں زبر اور پانچویں میں الف ہے۔ ن تمام الفاظ میں ساکن ہے اور اس کا تلفظ اس کے بعد آنے والے مصمتے سے ملا کر ایک ہی مخرج سے کیا جاتا ہے۔ فصلی نون بھی ساکت حالت میں آسکتا ہے، لیکن وہ اپنے بعد آنے والے مصمتے سے مل کر ایک ہی مخرج سے ادا نہیں ہوتا، مثلاً مانتا، دنیا، کنبہ، انوار، انکار۔ اردو میں فصلی نون اور وصلی نون محض خاص خاص آوازوں سے پہلے آتے ہیں۔ وصلی نون صرف مندرجہ ذیل آوازوں سے فوراً پہلے آکے ان سے ہم مخرج ہوسکتا ہے۔

ت، د، تھ، دھ
س، ز، ش
ٹ، ڈ، ٹھ، ڈھ
ج، چ، جھ، چھ
ک، گ، کھ، گھ

فصلی نون یعنی مختلف المخرج نون مندرجہ ذیل آوازوں سے پہلے مکمل اعلان کی صورت میں آتا ہے:

۱ - پ، ب، پھ، بھ
ک، گ، کھ، گھ
ف، م، ن، ف، و، خ، ہ، ر، ژ، ی۔
۲ - تمام مصوتوں سے قبل۔
۳ - لفظ کے آخر میں۔

اس تقسیم سے بظاہر شبہ ہوتا ہے کہ فصلی نون اور وصلی نون ایک دوسرے سے تکملی بٹوارے میں ہیں، یعنی دونوں میں سمجھوتا ہے اور جہاں ایک واقع ہوتا ہے، وہاں دوسرا نہیں آتا۔ اس لحاظ سے دونوں کو ایک فونیم کی دو ذیلی اصوات قرار دینا چاہئے، لیکن دراصل ایسا نہیں۔ اوپر کی تقسیم پر دوبارہ نظر ڈالنے سے واضح ہوگا کہ وصلی نون بھی غشائی آوازوں ک، گ، کھ، گھ سے پہلے آتا ہے اور فصلی نون بھی۔ مثال کے طور پر یہ مماثل جوڑے دیکھئے:

ڈنکا	پھنکی	گنکا	(وصلی نون)
منکا	سنکی	بھنگا	(۱) (فصلی نون)

(۱) ملاحظہ ہو، نقوش ۹۲ (ص ۲۱) اور اردو ادب ۱۹۶۱، شمارہ ۲ - (ص ۵۹) ڈاکٹر گیان چند نے ن فصلی اور وصلی کو ایک فونیم اور ن وصلی غشائی (نْ گ) کو دوسری فونیم مانا ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خان نے فقط ن اور ن وصلی کا ذکر کیا ہے، جبکہ عبدالقادر سروری صاحب نے اپنے نقشے میں ن اور نٌ (یعنی وصلی نون اور غشائی) (ملاحظہ ہو باقی صفحہ ۱۵ پر)

ڈنکا ، بھنکی اور گنگا میں ہم مخرج یعنی وصلی نون ہے جس کا اعلان مکمل طور پر نہیں ہوتا - اس کے برعکس منکا ، سنکی اور بھنگا میں فصلی یعنی مکمل اعلان کا نون ہے - صوتی ماحول دونوں کا ایک ہے یعنی دونوں نون غشائی ک ، گ ، سے پہلے واقع ہوئے ہیں - پس اس ایک ہی اصولی سے تکملی بٹوارے کا مفروضہ غلط ثابت ہوگیا ، کیونکہ ایک کی جگہ دوسری آواز واقع ہو سکتی ہے - صوتیاتی تجزیے میں جب دو آوازیں ایک ہی صوتی ماحول میں استعمال ہوسکتی ہوں تو وہ یقیناً ایک دوسرے کے متضاد ہوتی ہیں یعنی معنی کی تفریق میں مدد دیتی ہیں - جب ایسا ہو تو دونوں کو الگ الگ فونیم ماننا پڑے گا - چنانچہ اردو میں فصلی نون اور وصلی نون دونوں الگ الگ بنیادی آوازیں قرار پائیں -

یہ پہلے واضح کیا جا چکا ہے کہ فصلی نون کی خصوصیت مکمل اعلان ہے جو مصوتوں سے پہلے نیز صوتی رکن کے شروع یا آخر میں ہوتا ہے - فصلی نون کہیں بھی آئے اس کے تلفظ میں تبدیلی نہیں ہوسکتی - اس لئے اس کی کوئی ذیلی صوت نہیں - اس کے برعکس وصلی نون چونکہ فوراً بعد کے مصمتے سے مل کر ایک ہی مخرج سے ادا ہوتا ہے ، اس لئے مختلف مصمتوں کے زیر اثر اس میں خفیف تبدیلی ہوتی رہتی ہے - چنانچہ ان خفیف اختلافات کی بنا پر وصلی نون کو مندرجۂ ذیل پانچ ذیلی اصوات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے :

۱ - دنتی : ت ، د ، تھ ، دھ سے پہلے (مثلاً پنت ، تند ، سنتھال ، سگندھ)

۲ - بالادنتی : س ، ز ، ش سے پہلے (مثلاً آنس ، طنز ، انشا)

۳ - معکوسی : ٹ ، ڈ ، ٹھ ، ڈھ سے پہلے (مثلاً انٹی ، گنڈا ، کنٹھ ، منڈھا)

۴ - تالوئی : ج ، چ ، چھ ، جھ سے پہلے (سنجلا ، کنچ ، پنچھی ، منجھنا)

۵ - غشائی : ک، گ، کھ ، گھ سے پہلے (ڈنکا ، گنگا ، پنکھا ، کنگھا)

ظاہر ہے کہ وصلی نون کی یہ پانچوں ذیلی اصوات آپس میں تکملی بٹوارے میں ہیں یعنی ایک کی جگہ پر دوسری استعمال نہیں ہوسکتی -

لبی آوازوں یعنی پ ، ب ، پھ ، بھ سے پہلے وصلی نون نہیں آتا - البتہ م ان سے وصل کی حالت میں آسکتا ہے کیونکہ پ ب وغیرہ بھی لبی آوازیں ہیں اور م بھی - ہمارے رسم الخط سے اکثر یہ مغالطہ ہوتا ہے کہ یہی

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۲)

کی نشان دہی کی ہے - ہمارا تجزیہ ان سب سے قدرے مختلف ہے اور ہم نے سائنسی سہولت کی خاطر ن فصلی اور ن وصلی کو الگ الگ فونیم تسلیم کیا ہے - تقسیم کا انداز مختلف ہوسکتا ہے ، لیکن اتنی بات طے ہے کہ اردو میں ن کی دو بنیادی آوازیں ہیں ، ایک نہیں -

آواز پ سے پہلے وصلی نون استعمال ہورہا ہے، مثلاً : انبالہ ، گنبد ، دنبالہ، انبساط ، جنبش تنبولی، منبع ، چنبر ۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ان الفاظ میں ب سے ن کا نہیں بلکہ م کا وصل ہوا ہے اور ہم ان الفاظ کو م ہی سے بولتے ہیں ، یعنی: امبالہ ، گمبد ، دمبالہ ، امبساط ، جمبش ، تمولی ، ممبع ، چمبر۔

س، ص، ث اردو میں س، ص اور ث کا فرق بھی محض رسم الخط کی حد تک ہے ۔ اردو زبان کے صوتیاتی نظام میں ان کی تفریق کوئی معنی نہیں رکھتی۔ عربی میں یہ تینوں آوازیں مختلف المخارج ہیں، لیکن اردو میں ہم مخرج ہیں۔ اردو کے جن الفاظ میں ث، ص استعمال ہوتے ہیں، ان کا تلفظ غیر مسموع صفیری آواز س کی حیثیت سے ہوتا ہے ، چنانچہ اس بنا پر ص یا ث کو نہیں ، بلکہ صرف س کو فونیم تسلیم کیا جاسکتا ہے ۔

ز، ذ، ض، ظ اور ژ ماہرین لسانیات کا بیان ہے کہ مسموع صفیری آواز ز سنسکرت اور فارسی کی مشترکہ ماخذ ہند یورپی زبان میں مستعمل تھی، لیکن سنسکرت میں یہ آواز نہیں پائی جاتی ۔ سنسکرت اور ہند ایرانی دونوں میں غیر مسموع صفیری آواز س ماقبل آوازوں سے متاثر ہوکر تبدیل ہوجاتی تھی ۔ سنسکرت میں یہ تالوئی آوازوں کے بعد ش میں بدل جاتی تھی جب کہ ہند ایرانی میں مسموع آوازوں کے بعد یہ خود بھی مسموع ہوکر ز بن جاتی تھی۔ بعد میں اسی نے ایرانی میں ژ اور سنسکرت میں ج کا روپ اختیار کیا۔ چنانچہ ز اور ژ آوازیں ہند ایرانی کی جانشین فارسی میں تو ملتی ہیں ، لیکن ہند آریائی کی جانشین سنسکرت ، ہندی وغیرہ میں نہیں ۔ البتہ اردو میں ز اور ژ مستعمل ہیں اور اردو نے انہیں فارسی سے لیا ہے ۔

ژ کی آواز اپنی اصلی شکل میں اردو میں مستعمل فقط چند الفاظ میں ملتی ہے ، مثلاً مژدہ، ژالہ ، ژرف، پژمردہ، مژہ، مژگاں، ژولیدہ ۔ اردو میں اسے اکثر و بیشتر ز سے بدل کے بولا جاتا ہے اور چونکہ ایسا کرنے سے معنی کا فرق لازم نہیں آتا ، ژ کو اردو کی فونیم یعنی بنیادی آواز تسلیم کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ۔ ژ اور ز کا معنوی امتیاز ثابت کرنے کے لئے اردو میں کوئی اقلی جوڑا نہیں ملتا ۔ اس سلسلے میں زال اور ژالہ یا ژرف اور ظرف کی مثال دی جاتی ہے ۔ لیکن ایک تو یہ صحیح معنوں میں اقلی جوڑے نہیں ، دوسرے اس قسم کے الفاظ بھی اردو میں بہت کم استعمال ہونے ہیں ، اس لئے بہتر یہی ہے کہ ژ کو اردو فونیم نہ قرار دیا جائے ۔

ہمارے رسم الخط میں ز کی آواز کے لئے تین علامتیں اور بھی ہیں — ذ، ض، ظ۔ در اصل عربی میں ز ، ذ ، ض اور ظ مختلف اصوات ہیں اور مختلف مخارج سے ادا ہوتی ہیں ۔ اس کے برعکس اردو میں ان کے مخارج اور لہجے کی تفریق باقی نہیں رہی ۔ ہماری زبان میں یہ سب آوازیں صفیری ز میں بدل

جاتی هیں اور ایک هی مخرج یعنی اوپری مسوڑھوں کے پیچھے سے ادا هوتی هیں - غرض اردو میں ان کی تفریق صوتیاتی اعتبار سے کوئی معنی نہیں رکھتی کیونکه ان چاروں کے لئے صرف ایک صوت ز استعمال هوتی ہے، جسے اردو کی بنیادی آواز تسلیم کیا گیا ہے۔

مصوتی فونیم | اردو کی مصوتی فونم کی تعداد دس ہے۔ ذیل میں اقلی جوڑوں کا سلسله ملاحظه هو:

(۱)	َ		(زبر)	مَل
(۲)		ا	(الف)	مال
(۳)	ِ		(زیر)	مِل
(۴)		ی	(یائے معروف)	میل
(۵)	ُ		(پیش)	مُل
(۶)		او	(واؤ معروف)	مُول
(۷)	ِ	ے	(یائے مجهول)	میل
(۸)	َ	ے	(یائے لین)	مَیل
(۹)	ُ	و	(واؤ مجهول)	مول
(۱۰)	َ	و	(واؤ لین)	مَول(۱)

اردو کے دس بنیادی مصوتے بعینه وهی هیں ، جو هندی میں مروج هیں - ان کی دیوناگری علامتیں بالترتیب یوں هیں :

अ आ इ ई उ ऊ ए ऐ ओ औ

اقلی جوڑوں کے مندرجۂ بالا سلسلے سے ظاهر ہے که یه دس کی دس آوازیں اردو اور هندی میں فونیم کا درجه رکھتی هیں - لیکن اردو کی خصوصیت یه ہے که اس میں ان دس بنیادی مصوتوں کے علاوہ تین ذیلی مصوتے بھی ملتے هیں(۲) - (۱) خفیف زبر (۲) خفیف زیر ، (۳) خفیف پیش - اردو میں یه تینوں ذیلی مصوتے هائے هوز یا حائے حطی سے پہلے یا بعد میں بولے جاتے هیں۔ مثالیں ملاحظه هوں :

۱- خفیف زبر :

کہنا - سہنا - بہنا - وحدت - زحمت - احمد - محبوب - محسوس - محروم -

ان الفاظ میں دراصل پہلے حرف پر زبر ہے ، لیکن یہاں زبر نہیں بولا جاتا بلکه زبر کو خفیف زبر یعنی اَے کے انداز پر ادا کیا جاتا ہے۔

۲- خفیف زیر :

---

(۱) مول بمعنی کونپل (نیم کی مَول) فعل : مولنا (درحت مول رها ہے) مغربی اتر پردیش میں مستعمل ہے -

(۲) ملاحظه هو : ڈاکٹر گراهم بیلی ، اردو اور هندی کا تلفظ (اردو ادب ، دسمبر ۱۹۵۶ء) رشید حسن خاں ، لغت اور استعمال عام (اردو ادب مارچ ۱۹۵۷ء) حیات الله انصاری ، کشمیری زبان کے لئے ایک رسم الخط (اردو ادب ، دسمبر ۱۹۶۰ء) ڈاکٹر گیان چند جین ، اردو مصوتوں کی صحیح تعداد (نیا دور ، ستمبر ۱۹۶۱ء) شان الحق حقی ، اردو الفاظ کی رومن املا (اردو نامه شماره ۴) ڈاکٹر گیان چند نے اپنے ایک اور مضمون " اردو کی آوازیں " (اردو ادب شماره ۴ ، ۱۹۶۱ء) میں اردو کے سوله (۱۶) مصوتوں کی نشان دهی کی ہے - یه تقسیم نازک ترین صوتی اختلافات پر مبنی ہے ، مگر وہ خود بھی اس سے مطمئن نہیں - بعد میں انھوں نے طول کو صوتیه قرار دے کر صرف سات مصوتوں کو فونیم کا درجه دیا ہے - لیکن هم نے یہاں بنیادی مصوتوں کی مسلمه تقسیم یعنی دس کو هی پیش کیا ہے -

(الف) سحر ۔ محنت ۔ بہ ۔

ان الفاظ میں پہلے حرف کے نیچے زیر ہے ، لیکن یہاں زیر کا تلفظ خفیف زیر یعنی اے سے ملتی جلتی آواز میں کیا جاتا ہے ۔

(ب) بحث ۔ زہر ۔ لہر ۔ قہر ۔ شہر ۔ نہر ۔ صحن ۔

یہ الفاظ بھی دراصل شی اول کے الفاظ کی طرح بہ فتح اول اور بہ سکون حرف ثانی ہیں ۔ لیکن ان میں صرف زیر متاثر ہوا تھا ۔ یہ الفاظ چونکہ جڑواں مصمتے (Consonantal Cluster) پر ختم ہوتے ہیں ، اس لئے ان میں زبر کے خفیف زبر میں تبدیل ہونے کے علاوہ ہائے ہوز اور حائے حطی بھی حرکت کا اثر قبول کرتی ہیں اور ان کے فوراً بعد خفیف زیر یعنی اے سے ملتی جلتی آواز سنائی دیتی ہے ۔

(ج) محل ۔ مہک ۔ رہن سہن ۔ پہن ۔ بہن ۔ ٹہل ۔

یہ الفاظ بہ فتح اول اور بہ فتح دوم ہیں ۔ ان میں پہلا زبر ، خفیف زبر میں اور دوسرا زبر خفیف زیر کی آواز میں تبدیل ہوجاتا ہے ۔

۳ ۔ خفیف پیش :

عہدہ ۔ بہت ۔ شہرہ ۔ کہرام ۔ تحفہ ۔ وہ ۔

ان الفاظ میں ہائے ہوز اور حائے حطی سے پہلے یا بعد میں پیش ہے ۔ لیکن یہاں پیش نہیں بولا جاتا ، بلکہ ان الفاظ کا تلفظ خفیف پیش یعنی او سے ملتی جلتی آواز میں کیا جاتا ہے ۔

یہ تینوں مصوتے چونکہ بالترتیب زبر ، زیر اور پیش کی خفیف شکلیں ہیں ، اور ان کے جلی لہجے میں آزادانہ تغیر (Free variation) کا رشتہ ہے ، یعنی ایک کی جگہ پر دوسری صوت استعمال ہوسکتی ہے ، اور ایسا کرنے سے معنی کا فرق لازم نہیں آتا ۔ اس لئے انہیں فونیم کا درجہ حاصل نہیں ، بلکہ خفیف زیر کو زیر کی ، خفیف زبر کو زبر کی اور خفیف پیش کو پیش کی ذیلی صوت تسلیم کیا جاتا ہے ۔

نون غنہ یعنی مصوتی غنائیت (Nasalisation of Vowel) ناک کی تین آوازوں یعنی م ، ن فصلی اور ن وصلی کا ذکر کیا جاچکا ہے ۔ یہ تین مصمتے ہیں ۔ لیکن ناک کی آوازیں مصوتوں سے مل کر بھی ادا کی جاسکتی ہیں ۔ غنائی مصمتے کو ادا کرتے ہوئے منہ کا راستہ تقریباً بند کردیا جاتا ہے اور ہوا محض ناک سے خارج ہوتی ہے ۔ لیکن غنائی مصوتے کو ادا کرتے ہوئے آواز پیدا کرنے والی ہوا منہ اور ناک دونوں سے بیک وقت خارج ہوتی ہے ۔ ایسی آوازیں چونکہ اردو میں معنی کی تفریق میں مدد دیتی ہیں ، اس لئے انہیں فونیم کا درجہ حاصل ہے ۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اقلی جوڑے ملاحظہ ہوں :

ڈاٹ : ڈانٹ

باٹ : بانٹ

مے : میں

وصلی اور فصلی نون سے مصوتی غنائیت کا تضاد پیش کرنے کی ضرورت نہیں ، کیونکہ فصلی نون

میں اعلان نون مکمل طور پر اور وصلی نون میں جزوی طور پر ہوتا ہے جب کہ مصوتی غنائیت کی خصوصیت یہی ہے کہ اس میں اعلان نون قطعاً نہیں ہوتا۔

مصوتی غنائیت دو طرح کی ہے: سادہ مصوتی غنائیت اور مخلوط مصوتی غنائیت۔ مخلوط مصوتی غنائیت صرف مسموع بندشی اور مسموع ایفرکیٹ آوازوں یعنی ب ، بھ ، د ، دھ ، ڈ ، ڈھ ، گ ، گھ اور ج ، جھ سے پہلے ملتی ہے جب کہ سادہ مصوتی غنائیت بقیہ آوازوں سے پہلے اور لفظ کے آخر میں آتی ہے۔ مخلوط مصوتی غنائیت کی خصوصیت ہے کہ یہ بعد میں آنے والے مصوتوں سے متاثر ہوتی ہے۔ ب ، بھ سے پہلے اس میں خفیف سی م کی جھلک ، د ، دھ ، ڈ ، ڈھ ، ج اور جھ سے پہلے ن کی جھلک اور گ ، گھ سے پہلے ن گ کی جھلک آجاتی ہے۔ اس لحاظ سے مصوتی غنائیت کی مندرجۂ ذیل قسمیں ہوئیں:

۱- م سے مخلوط مصوتی غنائیت۔ یہ ب ، بھ سے پہلے ملتی ہے ، مثلاً: نانبی ، سانبھر۔
۲- ن سے مخلوط مصوتی غنائیت۔ یہ د ، دھ ، ڈ ، ڈھ اور ج ، جھ سے پہلے ملتی ہے ، مثلاً: چاند ، گوندھ ، مینڈھا ، گونڈ ، گونج ، سانجھ۔
۳- ن گ سے مخلوط مصوتی غنائیت۔ یہ گ ، گھ سے پہلے ملتی ہے مثلاً: ٹانگ ، سونگھ۔
۴- سادہ مصوتی غنائیت۔ یہ بقیہ تمام صورتوں میں اور لفظ کے آخر میں ملتی ہے ، مثلاً:

آنت ، کانپ ، پھانس ، ھانک ، آؤں ، جاؤں وغیرہ۔

مندرجۂ بالا چاروں آوازیں آپس میں تکملی بٹوارے میں ہیں اور اس طرح ایک فونیم یعنی مصوتی غنایت کی ذیلی اصوات قرار پائیں۔

ع اور ھمزہ ع اور ہمزہ اردو میں فونیم کا درجہ رکھتے ہیں نہ ذیلی اصوات کا۔ ان کا وجود محض رسم‌الخط کی حد تک ہے۔ آواز کی حیثیت سے اردو میں ان علامتوں کا کوئی مقام نہیں۔ جس طرح ص اردو میں س سے الگ کوئی آواز نہیں ، اسی طرح ع اور ہمزہ بھی مصوتوں سے الگ کوئی وجود نہیں رکھتے۔ عربی میں ع مسموع حلقی مصمتہ ہے۔ اس کے برعکس اردو والے ع کو مصمتے کی حیثیت سے ادا ھی نہیں کرسکتے۔ اردو میں عربی‌دان حضرات کی قلیل تعداد سے قطع نظر اکثریت کی زبان پر ع کی آواز ماقبل یا مابعد حرکت سے متاثر ہوکر دس بنیادی مصوتوں میں سے کسی ایک میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ یہ بات ذیل کی مثالوں سے واضح ہوجائے گی۔ ہر لفظ میں ع کی علامت جس مصوتے کی قائم مقام ہے ، وہ اس کے سامنے درج کردیا گیا ہے:

۱- عجب	(اجب)	َ	(زبر)
۲- عادت	(آدت)	ا	(الف)
۳- عبادت	(ابادت)	ِ	(زیر)
۴- عید	(اید)	ِ ی	(یائے معروف)
۵- عذر	(اذر)	ُ	(پیش)

۶- عود	(اود)		و	(واؤ معروف)
۷- جامع	(جامے)	ـــِـ	ے	(یائے مجہول)
۸- عیب	(ایب)	ـــَـ	ے	(یائے لین)
۹- شعبہ	(شو بہ)	ـــُـ	و	(واؤ مجہول)
۱۰- عَود	(اود)	ـــَـ	و	(واؤ لین)

اس میں شک نہیں کہ عروض میں (جس کے اصول و قواعد کی بنیاد عربی فارسی اصوات پر رکھی گئی ہے) ع کے احکامات الف یعنی مصمتے سے مختلف ہیں - الف کو دبایا جاسکتا ہے ، لیکن ع کو ہر حالت میں شمار کیا جاتا ہے : کیونکہ عربی فارسی میں صوتی اعتبار سے ع کی آواز امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے برعکس اردو میں ع کی اپنی کوئی آواز نہیں بلکہ یہ محض ایک علامت ہے جو مختلف مصوتوں کے لئے استعمال ہوتی ہے ، اس لئے اردو میں ع کا مصوتوں سے الگ وجود تسلیم ھی نہیں کیا جاسکتا - آخری حالت میں ساکن ع سے کبھی کبھی غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ اس کا تلفظ اردو مصوتوں سے مختلف ہے۔ لیکن ایسا صرف ع کو شعوری طور پر ادا کرتے وقت ہوتا ہے ، اور اس میں بھی جو کھٹک محسوس ہوتی ہے ، وہ صوتی وقفے سے زیادہ اھمیت نہیں رکھتی، ورنہ عام بول چال میں اس حالت میں ع کا تلفظ دراصل چھوٹے مصوتے کے طور پر ہوتا ہے -

ع کی طرح ہمزہ بھی اردو کے صوتیاتی نظام میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا - عربی میں ہمزہ ایک مستقل آواز ہے اور اسے حلقی بندشی مصمتے کی حیثیت سے ادا کیا جاتا ہے، لیکن اس کے برعکس اردو میں ہمزہ کی آواز مصمتے کی نہیں بلکہ مصوتے کی ہے اور یہ دوہرے مصوتوں میں زیر ، زبر ، پیش اور ان کی مدد سے لکھے جانے والے مصوتوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے - غرض ع کی طرح ہمزہ کی بھی اردو میں اپنی کوئی آواز نہیں اور یہ محض ''علامت بے صوت'' ہے - صوتی رکن کے شروع میں اس کی آواز الف کی ہوجاتی ہے -

نیم مصوتے (Semi Vowels) | اردو کے نیم مصوتے دو ھیں : و اور ی۔ مندرجہ ذیل اقلی جوڑے ملاحظہ ہوں :

وار	:	یار
وھاں	:	یہاں

اردو میں چونکہ مصوتوں کے لئے علامتیں بہت کم ھیں ، و اور ی سے دوھرا کام لیا جاتا ہے یعنی و اور ی علامتیں نیم مصوتوں کے علاوہ مصوتوں کے لئے بھی استعمال ہوتی ھیں - و اور ی کی ان دو حیثیتوں میں صوتیاتی اعتبار سے اہم فرق ہے۔ مثلاً لفظ 'یہی' میں علامت ی شروع میں بھی ہے اور آخر میں بھی - لیکن پہلی آواز نیم-مصوتہ ہے اور آخری مصوتہ - نیم مصوتے کی صوتی حیثیت کوپہلے واضح کیا جاچکا ہے مختصراً یہ کہا جاسکتاہے کہ مصوتے کو اداکرتے ہوئے منہ کے اندر ہوا کا راستہ نسبتہً کھلا رہتا ہے جب کہ نیم مصوتے کے لئے رکاوٹ پیدا تو کی جاتی ہے ، لیکن

پوری طرح نہیں ۔ اردو میں و اور ی آوازیں جب بھی لفظ کے شروع میں آتی ھیں تو ان کی حیثیت نیم مصوتے کی ہوتی ھے ۔ اس کے برعکس لفظ کے آخر میں یہ ہمیشہ مصوتے کی آواز دیتی ھیں ۔ اردو رسم الخط میں چونکہ ی اور و کی علامتوں سے دوہرا کام لیا جاتا ھے ، لفظ کے آخر میں ان پر نیم مصوتے کا دھوکا ہوسکتا ھے، لیکن دراصل آخری حالت میں نیم مصوتے کی حیثیت سے ان کا تلفظ اردو زبان کے صوتی مزاج کے خلاف ھے ۔ البتہ ہندی الفاظ کے آخر میں و اور ی کی آوازیں نیم مصوتوں کی حیثیت سے آتی ھیں ، مگر اردو والے ان الفاظ میں انہیں مصوتوں میں تبدیل کردیتے ھیں یا حذف کرکے بولتے ھیں ، مثلاً :

گانْو : گاؤں
چھانْو : چھاؤں
راجیہ : راج
ستیہ : ست (سچ)

اردو میں و کی تین ذیلی اصوات ھیں :

۱ ۔ لب دنتی و ۔ یہ لفظ کے یاصوتی رکن کے شروع میں آتی ھے ، مثلاً وہ، ورنہ، واحد یا چاول ، ساون ، باور ۔

۲ ۔ دولبی و ۔ یہ صرف اوپری مدور مصوتے کے بعد آتی ھے اور اردو میں بہت کم ملتی ھے ، مثلاً جوا ۔ ہندی میں سور بمعنی سُر ۔

۳ ۔ لب دنتی خفیف و ۔ یہ دو مصوتوں کے درمیان آتی ھے ، مثلاً : خواب ، خواہ، سوانگ ۔ واؤ یہاں دو مصوتوں کے درمیان پل کا کام دیتی ھے اور چونکہ اس کی مدد سے پہلا مصوتہ بتدریج دوسرے مصوتے میں ضم ہوتا ھے ، لسانیات کی اصطلاح میں اسے لہریہ (Glide) کہتے ھیں ۔

اردو میں ی کی دو ذیلی اصوات ھیں :

۱ ۔ ی ۔ یہ لفظ کے شروع میں آتی ھے ، مثلاً یہاں ، یاس ، یوم ، یادگار وغیرہ ۔ یا پھر وسطی اور آخری صوتی رکن کے شروع میں جب اس سے پہلے کوئی مصمتہ ہو ، مثلاً بنیا ، بریاں ، دنیا ۔

۲ ۔ خفیف ی ۔ یہ دو مصوتوں کے درمیان آتی ھے، مثلاً لیے، کیے، آیا، گیا ۔ ان الفاظ میں ی سے پہلے بھی مصوتہ ھے اور بعد میں بھی ۔ مختلف مصوتوں کے اعتبار سے اس کے نازک اختلافات کی نشاندھی کی جاسکتی ھے ۔ تاھم اتنی بات واضح ھے کہ دو مصوتوں کے درمیان ی کا تلفظ نہایت خفیف ہوتا ھے اور اس کے لئے زبان کو تالو کی طرف اتنا اونچا نہیں اٹھانا پڑتا جتنا لفظ کے یا صوتی رکن کے شروع میں ی کے لیے اٹھایا جاتا ھے ۔ خفیف ی دو مصوتوں کے درمیان لہریہ کا کام دیتی ھے ۔

بالا صوتی امتیازی عناصر Suprasegmental Phonemes اوپر جن مصمتی مصوتی اور نیم مصوتی فونیم کا ذکر کیا گیا، ان سب کو ملا کر بنیادی آوازیں (Segmental Phonemes) کہا جاتا ھے ۔ لیکن ہر زبان میں کچھ ایسے عناصر

بھی ہوتے ہیں جنہیں صحیح معنوں میں صوت تو نہیں کہا جاسکتا ، مگر جو اصوات کو متاثر کر کے معنی کی تفریق میں اہم مدد دیتے ہیں ۔ مثلاً لہجے کے اتار چڑھاؤ کا فرق اور الفاظ کو ملا کر یا توڑ کے بولنے کا فرق۔ لسانیات کی اصطلاح میں انھیں (Supra-segmental Phonemes) کہا جاتا ہے۔ اردو میں ہم انھیں زبان کے بالاصوتی امتیازی عناصر کہہ سکتے ہیں ۔ یہاں مختصراً اردو کے بالا صوتی امتیازی عناصر کی نشان دھی کی کوشش کی جاتی ہے ۔

زبان میں آوازوں کو ادا کرتے اور جملے کو بولتے ہوئے لہجے کے اتار چڑھاؤ (Intonaton) کا فرق بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے ۔ ہر زبان کے بولنے والوں کا مخصوص لہجہ ہوتا ہے اور لب و لہجے کی ذرا سی تبدیلی سے معنی کیا سے کیا ہو سکتے ہیں ۔ چند سال پہلے لسانیاتی مطالعے میں لب و لہجے کو کم و بیش نظر انداز کر دیا جاتا تھا ، لیکن جب سے یہ ثابت ہوا ہے کہ ہر زبان کے لب و لہجے کی مخصوص صوتی سطحیں (Pitch Levels) ہوتی ہیں ، جن سے معنی کی تفریق میں مدد ملتی ہے ، اس طرف زیادہ توجہ کی جانے لگی ہے ، بلکہ اب تو لب و لہجے کے ذکر کے بغیر صوتیاتی تجزیہ مکمل ہی نہیں سمجھاجاتا ۔ اردو میں لہجے کی خصوصیات پر ابھی کوئی کام نہیں ہوا ، اور یہ صوتی سائنسی آلات کی مدد کے بغیر ممکن بھی نہیں۔ تاہم سامعہ کے ذریعے لہجے کا جو فرق محسوس کیا جاسکتا ہے، ذیل میں اس کی طرف کچھ اشارے کئے جاتے ہیں ۔

سب سے پہلے اس مکالمے پر غور فرمائیے :

عمر : آپ کہاں جارہے ہیں ؟
زید : بازار
عمر : بازار ؟
زید : جی ہاں ۔

اس مکالمے کے دوسرے اور تیسرے کلمے میں بظاہر کوئی فرق نہیں یعنی ایک سی آوازیں ہیں اورایک ہی لفظ۔ پھر بھی سننے والے کو دونوں کلمے ایک سے محسوس نہیں ہوتے اور دونوں کے مفہوم میں فرق بھی ہے۔ یہ فرق بھی کیسے پیدا ہوگیا؟ ظاہر ہے کہ لہجے کی تبدیلی کا اثر ہے ۔

اردو میں لہجے کے فرق کی تین صوتی سطحیں نمایاں طور پر محسوس کی جاسکتی ہیں ۔ لسانیات میں انھیں ظاہر کرنے کے لئے عموماً ہندسوں سے کام لیا جاتا ہے ۔ ہم ۱ سے خفی ، ۲ سے میانہ اور ۳ سے جلی لہجہ مراد لیں گے۔ اب مندرجہ بالا مکالمے پر نظر رکھتے ہوئے دوبارہ غور کیجئے کہ عمر کے پوچھنے پر زید نے کس لہجے میں اسے جواب دیا ہوگا اور عمر نے پھر اسی لفظ کو دھراتے ہوئے کس لہجے میں دوبارہ زید سے سوال کیا ہوگا۔ ممکن ہے زید کے ہاتھ میں سامان خریدنے کی ٹوکری ہو اور اس نے سیدھے سادے طور پر جواب دیا ہو کہ یہ بدیہی بات ہے ، مجھے

بازار جاتا ھے ۔ اس صورت میں اس نے لفظ بازار کو میانہ لہجے میں کہنا شروع کیا ہوگا ، ز پر لہجہ جلی ہوگیا ہوگا اور پھر ر تک پہنچتے ہوئے خفی ۔ چنانچہ اسے ہم یوں ظاہر کر سکتے ھیں :

۲ ۳ ۱
با ز ا ر

یہ بھی ممکن ھے کہ زید نے کلمہ میانہ لہجے سے شروع کر کے خفی لہجے پر ختم کیا ہو :

۲ ۱
با ز ا ر

اس صورت میں زید بے دلی سے یہ بتانا چاھتا ھے کہ کیا کروں اور کوئی کام ھی نہیں ، اس لئے بازار جارھا ہوں ۔ لیکن اگر وہ یہ کہنا چاھے کہ جی ھاں، بازار جارھا ہوں ، اس لئے کہ اس وقت بازار جانا میرا معمول ھے ، تو وہ میانہ لہجے سے شروع کرکے کلمے کو جلی لہجے پر ختم کرے گا :

۲ ۳
با ز ا ر

اردو میں بیانیہ اور استفہامیہ جملے عموماً میانہ لہجے سے شروع ہوتے ھیں لیکن جس خاص مفہوم کی وضاحت مطلوب ہو ، اس سے متعلق لفظ پر زیادہ زور دیا جاتا ھے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل مثالیں ملاحظہ ہوں :

کیا آپ کتاب لینے بازار گئے تھے

کیا آپ کتاب لینے بازار گئے تھے

کیا آپ کتاب لینے بازار گئے تھے

کیا آپ کتاب لینے بازار گئے تھے

پہلے جملے میں لفظ آپ کو ، دوسرے میں کتاب کو، تیسرے میں لینے کو اور چوتھے میں بازار کو جلی لہجے میں ادا کیا گیا ھے اور ایسا کرنے سے ہر بار جملے کا مفہوم تبدیل ہوگیا ھے ۔ زبان میں لہجے کی صوتی سطحوں سے چونکہ معنی کا فرق قائم رکھنے میں مدد ملتی ھے ، اس لئے انھیں فونیم قرار دیا جاتا ھے ۔ اردو میں لہجے کی تین صوتی سطحوں خفی، میانہ اور جلی میں امتیاز کیا جاسکتا ھے، اس لئے یہ اردو کی تین فونیم قرار پائیں ۔

جوڑ (Juncture) اردو زبان میں الفاظ کی چند بندشیں ایسی بھی ھیں ، جنھیں ملا کر پڑھا جائے تو ایک معنی اور اگر توڑ کے پڑھا جائے تو دوسرے معنی اخذ ہوتے ھیں ۔ مثال کے طور پر ذیل کے جملے ملاحظہ ہوں :

(الف) مکڑی نے بنائے جالے
دوڑ آسے تو جا لے

(ب) جو کوئی کسی کو یار کہلاوے گا
یہ یاد رہے وہ بھی نہ کل پاوے گا

مثال الف کے پہلے کلمے میں جالے جمع ھے اسم جالا کی، لیکن دوسرے کلمے میں جب اسی لفظ کو صوتی توقف کے ساتھ توڑ کے پڑھا گیا تو مرکب فعل جا لینا کا صیغہ امر جالے ہوگیا جو معنی میں جالے یعنی اسم سے بالکل مختلف ھے ۔ اسی طرح دوسری مثال

کے پہلے کلمے میں کلپاوے کھڑی بولی کا مضارع ہے، مصدر کلپانا یا کلپاونا ہے، لیکن جب اسی کلپاوے کو ذرا سے صوتی توقف سے دو حصوں میں توڑ کے پڑھا گیا تو کل یعنی چین اور پانا مصدر سے پاوے مضارع حاصل ہوا ، اور ظاہر ہے کہ معنی بالکل تبدیل ہوگئے۔ دونوں مثالوں کے دوسرے کلموں میں جس صوتی توقف سے معنی کا فرق پیدا ہوا ، اسے لسانیات کی اصطلاح میں جوڑ (Juncture) کہتے ہیں۔ جوڑ چونکہ ایک معنی کو دوسرے معنی سے ممیز کرنے میں بنیادی آواز کا سا کام کرتا ہے ، اس لئے اسے بھی فونیم کا درجہ حاصل ہے ۔

اردو فونیم کی تعداد اوپر اردو کی ۲۴ مصمتی، ۱۱ مصوتی اور ۲ نیم مصوتی فونیم کا ذکر کیا گیا ۔ ان کے علاوہ ۴ بالا صوتی امتیازی عناصر کی نشان دہی بھی کی گئی ۔ اس طرح اردو کی کل فونیم ۴۱ ہوئیں ۔ ذیل میں ان کی مکمل فہرست پیش کی جاتی ہے :

۱- /پ/ (۱)
۲- /ب/
۳- /ت/
۴- /د/
۵- /ٹ/
۶- /ڈ/
۷- /چ/
۸- /ج/
۹- /ک/
۱۰- /گ/
۱۱- /ق/
۱۲- /م/
۱۳- /فصلی نون/
۱۴- /وصلی نون/ ۔ اس کی پانچ ذیلی اصوات ہیں : ۱ [دنتی] ۲ [بالا دنتی] ۳ [معکوسی] ۴ [تالوئی] ۵ [غشائی]
۱۵- /ف/
۱۶- /س/
۱۷- /ز/
۱۸- /ش/
۱۹- /خ/
۲۰- /غ/
۲۱- /ہ/ ۔ اس کی تین ذیلی اصوات ہیں : ۱ [ہائے مخلوط کامل] ۲ [ہائے مخلوط جزوی] ۳ [ہائے ملفوظی]
۲۲- /ل/
۲۳- /ر/
۲۴- /ڑ/
۲۵- /و/ ۔ اس کی تین ذیلی اصوات ہیں : ۱ [لب دنتی و] ۲ [دولبی و] ۳ [لب دنتی خفیف و]
۲۶- /ی/ ۔ اس کی دو ذیلی اصوات ہیں : [ی] اور [خفیف ی]
۲۷- /زبر/ ۔ اس کی دو ذیلی اصوات ہیں : [زبر] اور [امالہ دار زبر]

(۱) لسانیات کے اصولوں کے مطابق فونیم کو دو آڑی لکیروں سے اور الوفون کو سیدھی بریکٹ سے ظاہر کیا گیا ہے۔

۲۸- /الف/

۲۹- /زیر/ - اس کی دو ذیلی اصوات ھیں : [زیر] اور [امالہ دار زیر]

۳۰- /یائے معروف/

۳۱- /پیش/ - اس کی دو ذیلی اصوات ھیں : [پیش] اور [امالہ دار پیش]

۳۲- /واؤ معروف/

۳۳- /یائے مجہول/

۳۴- /یائے لین/

۳۵- /واؤ مجہول/

۳۶- /واؤ لین/

۳۷- /مصوتی غنائیت یعنی نون غنہ/ - اس کی چار ذیلی اصوات ھیں : ۱ [سادہ مصوتی غنائیت] ۲ [م سے مخلوط] ۳ [ن سے مخلوط] ۴ [ن گ سے مخلوط]

۳۸- خفی لہجہ /۱/

۳۹- میانہ لہجہ /۲/

۴۰- جلی لہجہ /۳/

۴۱- /جوڑ/

اُردو کی پہلی کتاب

مولانا محمد حسین آزاد کی درسی کتابوں کا سلسلہ

حصہ اول تا چہارم

پیش لفظ

جناب ممتاز حسن (ستارۂ پاکستان)

مقدمہ

ڈاکٹر اسلم فرخی

اس میں مولانا آزاد کی حسب ذیل درسی کتابیں یکجا شامل ھیں :

حصہ اول : اردو کی پہلی کتاب — حصہ دوم : اردو کی دوسری کتاب

حصہ سوم : اردو کی تیسری کتاب — حصہ چہارم : اردو کی چوتھی کتاب

نفیس ٹائپ کی طباعت خوب صورت سرورق — قیمت ہر چہار حصہ یک جلد ٦ روپے

شائع کردہ : ترقیٔ اردو بورڈ ، اردو منزل جمشید روڈ ، کراچی

اُردو کی ایک نادر مثنوی

(جنگ نامه من تصنیف مهاراجه اپورب کشن کنور)

شریف الحسن

راقم الحروف نے اردو نامه شماره هفتم بابت جنوری تا مارچ ۱۹۶۲ء میں اس مثنوی کے استانبول میں دستیاب هونے کا اعلان کیا تها اور استدعا کی تهی که کسی صاحب کو اس کا علم هو تو مطلع فرمائیں ۔ چونکه اردو نامے کے ذریعے کوئی معلومات حاصل نهیں هوئی ، اس نادر مثنوی کا تعارف لازم هے ۔ البته شروع هی میں یه عرض کردینا بیجا نه هو گا که نادر هونے کے سوا یه مثنوی هر طرح کی ندرت ، زبان کی لطافت ، قصے کی جاذبیت یا جدت سے قطعاً معریٰ هے ۔ کلام اکثر جگه بے ربط هے بلکه بهت کچھ مهمل هے، یهاں تک که بعض بعض جگه مطلب بالکل خبط هوجاتا هے اور مجذوب کی بڑ معلوم هوتا هے ۔ کهانی کا ڈهانچه فرسوده بلکه بےسر و پا هے ۔ البته مثنوی میں ایک ٹکڑا ایسا هے جو شاید تاریخ ادب اردو کے سلسلے میں کچھ دلچسپ هے ۔ اس سے پهلے که حکایت کا خلاصه دیا جائے اور زبان سے بحث کی جائے کتاب اور مصنف کا تعارف کرانا ضروری هے ۔

اس کتاب کی تقطیع ۲۳×۱/۲ ۱۴ سنٹی میٹر هے ۔ بائیں طرف کا سرورق انگریزی میں هے اور اس کے بعد دو صفحے کا انگریزی زبان میں مصنف کا مقدمه هے ۔ دائیں طرف کا اردو سرورق ندارد هے ۔ یه بهی نهیں معلوم که اردو میں بهی کوئی دیباچه تها یا نهیں۔ خود مثنوی کے ۹۸ صفحے هیں ، گو مکمل نهیں مگر اندازه هوتا هے که آخر سے صرف ایک ورق یا یه کهئے که محض ایک صفحه ضائع هوا هے ۔

انگریزی سرورق میں کتاب کا نام صرف مثنوی درج هے گو متن سے معلوم هوتا هے که پورا نام ''جنگ نامه'' هے ۔ انگریزی سرورق پر مصنف کا نام انگریزی کے علاوه اردو میں اس طرح درج هے : '' من تصنیف مهاراجه اپورب کشن بهادر ، شاعر خاص شاهنشاه دهلی سردار مدرسهٔ عالیه همبرگ ۔'' یه راز نهیں کهلتا که همبرگ سے کیا مراد هے ۔ اس کے نیچے مستطیل سیاه مهر میں سفید انگریزی حروف میں راجه صاحب کا نام اور لقب

یعنی شاعر شہنشاہ دهلی اور ۱۸۴۶ درج هے مگر صفحے کی آخری سطر میں سنه طباعت ۱۸۴۴ پڑھا جاتا هے ۔ اس سے اوپر کی سطروں میں لکھا ہوا هے که مولوی قسیم‌الدین اور مولوی ظہورالنبی کے اهتمام سے سوبها بازار، کلکته میں چھپی ۔ سنوں کے اختلاف کی دو توجیہیں هو سکتی هیں ، یا تو ۱۸۴۴ غلط چھپا هے یا یه که ۱۸۴۴ء میں کتاب کے چھپنے کے بعد ۱۸۴۶ء میں راجه صاحب کو بہادر شاہ ظفر کی طرف سے شاعر خاص کا لقب ملا اور اس خوشی میں انہوں نے سهر بنوا کر از سرنو سرورق پر چھپوائی ۔ کتاب پر قیمت درج نہیں هے ۔ اندازه هوتا هے که چونکه راجه کہلاتے تھے اور خوسحال تھے اس لئے دوستوں میں مفت بانٹنے کے لئے چھپوائی هو گی، بلکه اس کی تصدیق دیباچے سے هوتی هے۔ ذیل میں دیباچے کا ترجمه لطف سے خالی نه هو گا:

”جن لوگوں کو هندوستان آنے اور یہاں کچھ مدت ٹھہرنے کا خواہ کتنی هی مختصر کیوں نه هو اتفاق هو ان کے لئے عام هندوستانی زبان کا جاننا لابد هے ۔ اس کے بغیر ایک اجنبی تمام تر دوسروں کا محتاج رهے گا اور بلاشبه اپنے دهوکه باز نوکروں کا شکار هو گا جن کی بدمعاشیاں اور بددیانتی قریب قریب ضرب‌المثل بن گئی هے ۔ یه زبان جو هندوستان بھر میں هر جگه سمجھی جاتی هے محض زبان اردو کا بگاڑ هے ۔ چنانچه وه تمام پڑھے لکھے لوگ جن کا هندوستان سے کچھ بھی تعلق هو ان کو چاهئے که مؤخرالذکر زبان کی ترقی میں کوشاں هوں ۔ یه اتنی خوش آهنگ هے که ان زبانوں میں سے جنهیں ان اوراق کا مصنف تھوڑا بہت جانتا هے یعنی عربی، فارسی، انگریزی ، بنگالی ، سنسکرت اور اردو ، اس نے اپنے مطالعے کے لئے اسی مؤخرالذکر زبان کو پسند کیا هے اور فرصت کے اوقات میں اپنا دل بہلانے کے لئے یه قصه جو هدیهٔ ناظرین کر رها هے ، اردو میں نظم کیا هے ۔ اس قصے کو شائع کرنے سے اس کا مقصد یه هے که اردو زبان میں جو چند کتابیں موجود هیں ان میں ایک اور کتاب کا اضافه کرے ۔ اسے امید هے که یه دلچسپ کہانی جو ان اوراق میں درج هے، قارئین کو اس کے مطالعے میں فرصت کے چند گھنٹے صرف کرنے پر مائل کرے گی ۔ اس شیریں نیز نہایت کارآمد زبان میں کتابوں کی کمیابی بھی شاید اس کے مداحوں کو اس کتاب کی ورق گردانی پر آماده کرے ۔

”فارسی زبان کا سرکاری دفاتر سے اٹھ جانا اور سارے صوبه‌جات شمال مغربی میں اردو زبان کا اس کی جگه لے لینا بھی مؤخرالذکر کی اهمیت کے بڑھنے کا سبب هوا هے ۔ چنانچه وه لوگ بھی جو برطانوی حکومت هند کے تحت ملازمتوں کے خواستگار هیں، اس زبان کا مطالعه کریں گے ۔ سنسکرت کی طرح اسے مرده زبان تصور نہیں کرنا چاهئے ۔ اس کا استعمال روز بروز بڑھ رها هے اور همارے روز کے کام کاج میں

اس کا جاننا ضروری سمجھا جاتا ہے ، لہذا اس کی پیدائش اور خصوصیات کا مجمل بیان یہاں بے محل نہ ہوگا ۔

"اردو زبان، عربی، فارسی، سنسکرت اور برج بولی کی آمیزش سے مرکب ہے ۔ جب دلی سلطنت ہندوستان کا پائے تخت تھی تو چار جانب سے لوگ اس شہر میں اکٹھے ہوگئے تھے ۔ جو لوگ پچھم سے یعنی ایران ، عرب وغیرہ سے آئے تھے وہ ایسی زبان بولتے تھے جو نہ پورب سے آئے ہوئے لوگ سمجھتے تھے نہ دارالسلطنت کے باشندے۔ اول الذکر زیادہ ستھری اور منجھی ہوئی مگر عربی و فارسی سے ممزوج زبان بولتے تھے اور مؤخرالذکر سنسکرت اور برج بولی سے مرکب روڑھی ہندوستانی ۔ اسلامی فتوحات کے بعد امیر تیمور نے اپنی چھاؤنی کا بازار شہر دہلی میں بسایا تھا جہاں مشرق و مغرب سے آئے ہوئے اور بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والے لوگوں کے سنگم سے ایک زبان وجود میں آئی جو اردو سے موسوم ہے ۔ اس کی واحد خصوصیت بلکہ میں کہوں گا کہ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں تذکیر و تانیث کی تمیز ہے جو کلمات کے آخری حروف سے ظاہر کی جاتی ہے ۔ اس زبان میں تذکیر و تانیث کی تفریق نر و مادہ جانوروں تک ہی محدود نہیں بلکہ بےجان اشیاء کو بھی شامل کیا ہے ۔ البتہ اس کا کوئی معین قاعدہ نہیں ہے ، یہ تمامتر سماعی ہے ۔ چنانچہ محض اردو صرف و نحو جاننے والا یہ تفریق نہیں کرسکتا۔ تذکیر و تانیث کی ایسی غیر قیاسی تفریق دوسری زبانوں میں بھی ہے مثلاً سنسکرت میں، مگر اردو میں اور زبانوں سے زیادہ ہے ۔ جو لفظ فارسی ابجد کی ت ، ش اور ی پر ختم ہوتے ہیں وہ بالعموم مونث ہوتے ہیں۔ جو الف یا ہائے ساکن پر ختم ہوتے ہیں وہ بالعموم مذکر ، ہاتھی ، پانی اور چند دوسرے الفاظ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ یہ ی پر ختم ہوتے ہیں مگر ہمیشہ مذکر آتے ہیں ۔ اس طرح کا استثناء اوپر کے تمام قاعدوں میں پایا جاتا ہے ۔ اردو بولنے والوں میں دلی نیز لکھنؤ کے عالم مولوی صحیح اردو بولتے ہیں۔ اس زبان کی صرف و نحو جو گلکرسٹ صاحب نے اور لغات ہنٹر صاحب نے شائع کی تھی ، مگر جو لوگ اس زبان کے ماہر ہیں وہ ان کتابوں کو حوالے کے لئے بہت مستند نہیں مانتے۔ اس کتاب کے مصنف کے والد مہاراجہ راج کرشن بہادر مرحوم جو اپنے زمانے کے فارسی اور اردو زبانوں کے بڑے مصنف تھے ان صاحبوں کی چھاپی ہوئی کتابوں سے کبھی رجوع نہیں کرتے تھے۔ اس زبان سے کافی واقفیت، وسیع مطالعہ اور دلی و لکھنؤ کے بڑے مولویوں سے گفتگو کرنے ہی سے حاصل ہوسکتی ہے ۔

"مصنف یہ کتاب کسی منفعت یا ستائش کے حصول کے لئے ہدیۂ ناظرین نہیں کررہا، اس نے اسے اپنے ذاتی خرچ پر چھپوایا ہے اور اس کا صریح مقصد یہ ہے کہ اسے ایسے اصحاب کی خدمت میں پیش کرے جو علم اور اہل علم

کی ہمت افزائی میں مشہور ہیں ۔ اس کو یہ دعویٰ بھی نہیں ہے کہ یہ قصہ اس کا اپنا طبع زاد ہے بلکہ اس نے اس کا خاکہ دو تین ترکی فارسی بنگالی قصوں سے اخذ کیا ہے جنھیں وہ تفریحاً پڑھا کرتا تھا ۔

"اپورب کرشن"

راجہ اپورب کرشن کی انگریزی تحریر با محاورہ بلکہ منشیانہ ہے اور عبارت مربوط ہے ۔ تعجب ہوتا ہے کہ خود اپنی زبان میں انہوں نے ایسی بے ربط پھیکی سیٹھی بلکہ مبتدیانہ مثنوی لکھی ہے جس کا ڈھانچا گھسا پٹا ہی نہیں بے سروپا بھی ہے ۔ جیسا کہ ہم نے شروع میں بیان کیا ہے مثنوی کے ۹۸ صفحے ہیں، ہر صفحے میں ۱۶ سطریں یا ابیات ہیں۔ سرخیاں چھوڑ کر ابیات کی تعداد ۱۰۳۳ ہے جس میں ۷ شعر کی ایک غزل شامل ہے ۔ مثنوی سربی حروف میں خط نستعلیق میں چھپی ہے مگر خط بھدا ہے۔ حروف کے جوڑ اور نشست ٹھیک نہیں اور طباعت کی غلطیوں کی گنتی بھی کم نہیں ۔

اس زمانے کے عام دستور کے مطابق داستان باسم‌اللہ اور "المثنوی فی حمدالباری جل شانہ و تعالیٰ" سے شروع ہوتی ہے ۔ پہلا شعر ہے :

بیاں میں کروں حمد ربّ‌العلا
نہیں جس کا ثانی کوئی دوسرا

کہانی کا خلاصہ حسب ذیل ہے :

روم (یعنی ایشائے کوچک) میں ایک بادشاہ تھا ۔ اسے ہر طرح کا عیش میسر تھا مگر غم تھا تو فرزند کے نہ ہونے کا ۔ ایک فقیر ناگہاں وارد ہوا ۔ اس نے ایک پھل دیا جسے بادشاہ اور شاہ بیگم نے کھایا ، اس کی تاثیر سے پسر تولد ہوا جس کا نام جہاں‌دارشاہ رکھا گیا ۔ بڑا ہوا تو عمدہ تربیت دی گئی۔ وزیر کا بیٹا بہر جنگ اس کا دوست تھا ۔ اب شاہ روم کو یہ سوجھی کہ خاقان چین کو اپنا باج گزار بنائے ۔ ایلچی کے ہاتھ خط بھیج کر خزانہ طلب کیا جس پر خاقان بہت برہم ہوا ۔ غرض روم و چین میں جنگ ٹھن گئی، دونوں طرف کے پہلوان نبردآزما ہوئے، ساٹھ دن لڑائی رہی ۔ چینی پہلوان پلنگیں نے ۱۳۸ رومی پہلوان مار ڈالے ۔ آخر لشکر روم بھاگ نکلا ۔ شاہ روم نے دوبارہ تین لاکھ ایک ہزار کا لشکر تیار کیا ۔ خاقان چین نے بھی مقابلہ پر لشکر بھیجا جس میں پچاس‌ہزار ہاتھی تھے ۔ لڑائی شروع ہوئی، بالآخر لشکر روم نے ایک‌دم ہلہ بول دیا جس سے دشمن کے پاؤں اکھڑ گئے ۔ مگر خاقان نے پھر فوج اکٹھی کی ۔ اس بار محاربہ دو برس جاری رہا اور میدان چینیوں کے ہاتھ رہا ۔ آئندہ حملوں کے سدباب کے لئے لشکر چین نے روم پر دھاوا بول دیا۔ اب خود شاہزادہ جہاں‌دار شاہ مقابلہ کو نکلا ۔ بہر جنگ کو کمک پر لیا جس نے پچپن ہزار کا لشکر تیار کیا تھا ۔ اس زمانے میں بھی اسلحہ حرب میں توپ بندوق جزائل کے علاوہ تمنچے اور پستول بھی موجود تھے ۔

بالآخر اس چوتھی جنگ میں چین کو شکست فاش ہوئی۔

اس مقام پر پہنچ کر شاعر اپنے مربی بہادرشاہ ظفر کے حق میں کنایتہ دعا کرتا ہے:

کنور ہے دعا گو ترا روز و شب
دل و جاں سے اے شاہ عالی نسب
خدا سے یہی چاہتا ہے سدا
اسی طرح تیری ظفر ہو شہا
لکھا جنگ نامہ کو جس ڈھنگ سے
ظفر تیری یارب ہو اس رنگ سے
(صفحہ ۳۲)

مگر چین پھر برسرپیکار ہوا ، پانچویں دفعہ حرب دو مہینے جاری رہی ، چینیوں نے کاٹھ کے سپاہی بنا کر لڑائے ، سمندر میں آگ لگائی ، جواباً جہاندار شاہ نے خاقان چین کا حصار سرنگ لگا کر باروت سے اڑا دیا ، خاقان چین مارا گیا - جہاں‌دار شاہ نے چین میں جشن منایا اور محفل سرور منعقد کی - گانے بجانے کے ذکر پر کنور بہادر کو محمد شاہ بادشاہ کا خیال آیا (ص ۳۳-۳۴):

قدر موسیقی کی وہی جانتا
محمد شہ اس کو بہت مانتا
رنگیلا ہو بیٹھا کیا تخت پر
اٹھا یا مزا اپنی وہ بخت پر
کیا ٹپے(۱) کو اس نے ایجاد خوب
کیا موسیقی علم آباد خوب
گوئیے گنی اس سے سب شاد تھے
سبھی ملک میں اپنے آباد تھے
امیران وزیران تھے سب خیر خواہ
محمد شہ اس وقت تھا بادشاہ
عجب لوگ تھے اور عجب راگ تھا
عجب لاگ تھی اور عجب بھاگ تھا
میسر سبھی کو کہاں ناچ و رنگ
پڑا ملک ویرانہ در سیف زنگ
قدر اس کی راجہ مرا جانتا
وہ رہتا کنور تو نرا (؟) جانتا

جشن اور دربار کے بعد جہاں‌دار شاہ نے باپ کی اجازت سے چین کے شہزادے کو خاقان چین بنادیا اور اس کا پگڑی بدل دوست بن گیا۔ عیش و عشرت سے دل بھر گیا تو جہاں‌دار شاہ ایک دن شکار کو نکلا ، ایک ہرنی کے پیچھے گھوڑا ڈالا۔ اس کے تعاقب میں ایک طلسماتی مکان میں جا گھسا۔ وہاں ایک شاہزادی پر عاشق ہو گیا - اس نے کہا کہ ہرنی میں ہی تھی اور میں پری ہوں - ایک دن تخت رواں میں اڑ رہی تھی کہ تجھ کو دیکھ کر تجھ پر عاشق ہوئی تھی۔ غرض دونوں دادعیش دینے لگے ، مگر جلد ہی پری کی ماں کے مرنے کی خبر آئی اور وہ چلی گئی۔ پھر جو جہاندارشاہ نے دیکھا تو وہ طلسماتی مکان ندارد تھا۔

پری کے ہجر میں مبتلا جہاں‌دار شاہ بادیہ گردی کرنے لگا - بیابان میں ایک جوگن ملی، اس نے بتایا کہ وہ دراصل گلنار سلطان ،

(۱) بہ قول فرہنگ آصفیہ ٹپے کا موجد شوری پنجابی تھا۔

شاہ ایران کی بیٹی ہے ۔ ایک بار ایران پر غنیم چڑھ آیا تھا ، جنگ پر اس کا چچازاد بھائی، خورسند نامی بھی گیا مگر پلٹ کر نہ آیا ۔ اس کے صدمے میں شاہ ایران مرگیا ، اس وقت چچازاد بھائی یک بیک نمودار ہوا، گلنار سے نمک حرامی کی اور جنگ کر کے اس سے ملک چھین لیا ۔ گلنار وفادار وزیر کے ہمراہ نکل کھڑی ہوئی، وزیر مصور بھی تھا، تصویر کشی سے گذارا کرتا تھا ۔ اس کی شہرت شاہ روس تک پہنچی ۔ وزیر با تدبیر ایک دن شاہ روس کو اکسا کر سکار پر لے گیا ۔ شاہ روس جنگل میں مجھے دیکھ کر عاشق ہوگیا اور ہم دونوں کی شادی ہوگئی ۔ ایک رات ہم دونوں چھپر کھٹ پر سو رہے تھے کہ ایک پری ہوبہو میری شکل اختیار کر کے برابر آن لیٹی ۔ ہم دونوں میں تمیز ناممکن تھی ۔ وزیر نے پہچان بتائی کہ میرے زانو پر تل ہے ، وہ تک اس پری کے تھا ۔ غرض سب کچھ چھ ن کر مجھے نکال دیا گیا ۔

اس مقام پر جہاں‌دار شاہ اس کی تسلّی و تشفی کے لئے شاہزادہ اینیس کی حکایت سناتا ہے۔ کنور صاحب نے یہاں ورجل (Virgil) کی (Aeniad) کی مٹی پلید کی ہے ۔ جیسا کہ شروع میں اشارہ کیا گیا ہے ، یہ ٹکڑا شاید تاریخ ادب اردو کے سلسلے میں کچھ دلچسپ ہے ۔ غالباً اردو ادب میں یا کم از کم اردو نظم میں یہ قصہ پہلی بار اس مثنوی کے واسطے سے آیا ہے۔ کنور صاحب نے اس قصے کا خاکہ (۵۵) شعروں میں اڑایا ہے (ص ۸۷ تا ۸۲) ۔ قصہ یوں شروع ہوتا ہے :

عرب کی طرف ملک تھا اک ٹرائے
کہ خلقت تھی واں کی زبس اہل رائے
ملک زادہ کا اینیس نام تھا
جہاں کا وہ اک نیک فر جام تھا

رومی یعنی یونانی اس بستی کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں ۔ مجبوراً ملک زادہ یعنی اینیس بھاگ کھڑا ہوتا ہے :

کچھ اک فوج تھی ساتھ کچھ مال تھا
برائی کا آثار اور حال تھا
کہ اک اس کی جورو طرح دار تھی
کہ سو میں سے وہ اک دلازار تھی

(بظاہر یہ اشارہ اینیس کی زوجہ کی طرف نہیں بلکہ ہیلن (Helen) کی طرف معلوم ہوتا ہے۔ القصہ اینیس کے جہاز کرتیج یعنی (Carthage) پہنچتے ہیں۔ وہاں شاہزادی ڈائیڈو (Dido) اس پر عاشق ہو جاتی ہے مگر وہ اسے چھوڑ کر چلا جاتا ہے تو آگ میں جل کر جان دے دیتی ہے۔ بالآخر شاہزادہ اینیس لوینیا پہنچتا ہے (یہ درست نہیں ۔ Lavinia دراصل (Latinus) کی بیٹی تھی جس سے اینیس کی شادی ہوئی اس کے نام پر اینیس نے (Laviniunr) نامی شہر آباد کیا تھا)۔ وہاں کے بادشاہ کی بیٹی سے اس کی شادی ہوجاتی ہے ۔ ایک اور پڑوس کا بادشاہ ٹرنس (Turnus) بھی اس سے شادی کرنے کا آرزو مند تھا۔ غصے میں آ کر اس نے جنگ چھیڑ دی مگر اینیس نے فتح پائی :

ظفر یاب ہو اینیس بادشاہ
کیا بیاہ اس کو ہوا شاد شاہ
شہنشاہ سب ان کی اولاد ہے
آنی کے سبب روم(۱) آباد ہے
پھرا جیسا اُس کا نحوست کا دن
تمھارا بھی کٹ جاوے گا ایسا دن

جہاں دارشاہ کی اس تقریر کے بعد کہانی پیچیدہ تر ہوجاتی ہے اور کنور صاحب کا ناہموار کلام سمجھنا دشوار تر ہوجاتا ہے۔

البتہ اس سے پہلے کہ سلسلۂ کلام کو جاری رکھا جائے ایک اور نکتے کی طرف اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اردو کے قصوں میں سلطان روم، خاقان چین، شاہ ایران کا ذکر تو عامتہ الورود ہے مگر بادشاہ روس کا ذکر قارئین کو شاید اجنبی سا معلوم ہو۔ شاہ روس کو داستان میں شامل کرنے کا خیال کنور صاحب کو دو طرح سے آسکتا تھا۔ ایک تو انگریزی کتابوں اور اخباروں کے مطالعے سے، دوسرے فارسی کی درسی کتب اور دیگر مثنویوں کے مطالعے سے، جو زیادہ قرین قیاس ہے۔ اس زمانے میں نظامی گنجوی کا اسکندر نامہ درس میں شامل تھا۔ اسکندر نامے میں اسکندر کے روسیوں پر چڑھائی کرنے اور ملکۂ نوشابہ کو قید سے چھڑانے کا بیان ہے۔ علاوہ ازیں خمسۂ نظامی کی مثنوی ہفت پیکر میں ایک صقلبی شاہزادی بہرام گور کو روس کے ایک شہر کی داستان سناتی ہے۔

اس جملۂ معترضہ کے بعد بقیہ کہانی کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔ کنور صاحب کے اوٹ پٹانگ اشعار سے کچھ یہ اٹکل ہوتی ہے کہ ہوشنگ نامی ایک جلاہا بی چاندنی نام ایک کسبی پر عاشق ہوگیا تھا:

وہ تھی مال‌زادی نہ تھی پردہ‌دار
بہت چست و چالاک اور غمزہ‌دار
تھا بی چاندنی نام گل فام تھی
کمانے میں خرچی نہ وہ خام تھی
بجز اس کے رکھتی نہ تھی آس وہ
کہ لے اشرفی لیٹتی پاس وہ
(ص ۸۵)

مگر جب بوڑھی ہوگئی تو عاشقوں نے پوچھنا چھوڑ دیا:

یہ کہتے ارے خانگی دور ہو
تو بڑھیا ہوئی چاندنی دور ہو
(ص۸۶)

اس پر چاندنی کو بڑا طیش آیا۔ ایک جادو گرنی کے پاس گئی جس نے اسے ایسی انگوٹھی دی کہ اس کے زور سے جو صورت چاہے اختیار کر سکتی تھی۔ چنانچہ کایا کلپ کرکے ازسر نو نوجوان بن کر اس نے لوگوں کو پھر لوٹنا شروع کر دیا۔ ہوس بڑھی تو اس نے اپنے عاشق ہوشنگ کو خورسند شاہ ایران کا ہم شکل بنا کر ایران کا بادشاہ بنادیا۔ قضارا ایک غنیم چڑھ آیا۔ ہوشنگ آخر تھا تو جولاہا، ڈر گیا۔ دونوں ایران سے بھاگ کر روس

(۱) (بحوالہ مادہ ہائے ''روس'، و ''مثنوی'' و ''نظامی''۔ انگریزی انسائیکلوپیڈیا آف اسلام طبع اول)

پہنچے - وہاں چاندنی نے نیا پاکھنڈ پھیلایا اور گلنار کی جگہ ملکہٗ روس بن بیٹھی - جیسا اوپر مذکور ہوا ، ایک دن شاہ روس کو شبہ ہوا ، دھوکے سے اچانک محل میں گیا تو دیکھا اپنے آشنا کے ساتھ محو ناؤنوش ہے - بادشاہ نے تلوار کے وار سے اس کا کام تمام کیا تو چاندنی اپنے بڑھاپے کے اصلی روپ میں نظر آئی - ہوشنگ گرفتار ہوا تو اس نے مندرجہٗ بالا قصہ سنایا - (ص ۸۴)

الغرض شاہ روس جنگل میں گلنار کو ڈھونڈھ نکالتا ہے ، دونوں بغلگیر ہوتے ہیں - جہاں‌دار شاہ سے بھی تعارف ہوتا ہے ، دونوں دوست ہوجاتے ہیں اور بادشاہ شام حسن شاہ پر حملے کی تیاری کرتے ہیں ، جس نے ہوشنگ جلاہے سے ملک ایران چھینا تھا - حسن شاہ ڈر جاتا ہے ، خراج دیتا ہے اور ملک ایران سے دست‌بردار ہوجاتا ہے - شاہ روس جہاں‌دار شاہ کے حسن خدمت سے خوش ہو کر اسے اپنا ملک دینا چاہتا ہے مگر وہ قبول نہیں کرتا اور آخر کار اپنے ملک یعنی روم واپس چلاجاتا ہے - وہاں اس کی بچھڑی ہوئی معشوقہ حور پرستان بھی پہنچ جاتی ہے - دونوں کا گندھرپ بیاہ ہوجاتا ہے اور ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے لگتے ہیں :

رہے دونوں جس طرح وے شاد ہو
کنور اس طرح رہ تو آباد ہو

کشن جی کی کرپا سے سب شان ہے
قدم پر تصدق مری جان ہے
(ص ۹۸)

پڑھی جو ہیں محز(و)ں نے میری کتاب
کہی اس نے تاریخ بنگلہ شتاب
یہ ہے اس کی تاریخ اسرار خیز
ہمیشہ رہے گلشن نور بیز
(ص ۹۸ آخری بیت)

آخری مصرع کے اعداد بروئے حساب جمل ۱۲۵۰ نکلتے ہیں - اگر یہ ہجری تاریخ ہے تو اس کے مطابق عیسوی تاریخ ۱۸۳۴–۱۸۳۵ء ہوتی ہے ، گویا یہ مثنوی طباعت سے کوئی نو دس سال پہلے لکھی گئی تھی - مگر جیسا کہ اوپر نقل کیا گیا ہے مثنوی میں تین دعائیہ اشعار میں کنایہ بہادر شاہ ظفر کی طرف ہے جن کا سال جلوس ۱۸۳۷ء ہے ، ممکن ہے کہ ۱۸۴۴ء میں طباعت کے وقت جب کنور صاحب شاعر خاص شہنشاہ دہلی کے لقب کے حصول کے لئے کوشاں تھے یہ شعر بڑھا دئے گئے ہوں - معلوم نہیں تاریخ بنگلہ سے شاعر کی مراد تاریخ بزبان بنگلہ ہے یا تاریخ ابجدی بحساب تقویم بنگلہ - استانبول میں بیٹھ کر کسی بنگلہ تقویم کا پتا نہیں لگ سکا مگر اغلب گمان ہے کہ انیسویں صدی میں کوئی ایسی بنگلہ تقویم رائج نہ تھی جو ہجری سنہ سے اس قدر قریب ہو - (۱) یہاں یہ یاد دلانا دلچسپی سے خالی

---

(۱) انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا (مطبوعہ ۱۹۵۸ء) میں Calendar اور Chronology کے تحت کسی ایسی بنگلہ تقویم کا کوئی ذکر نہیں ہے -

نہ ہوگا کہ گلزار نسیم کا سنہ تالیف ۱۲۵۴ھ (۱۸۳۸ء) اور سنہ طباعت ۱۲۶۰ھ (۱۸۴۴ء) ہے -

مثنوی کی زبان اردو کے وسطی دور کی زبان ہے مگر انیسویں صدی کے نصف اول کی نسبت اٹھارویں صدی کے نصف آخر کی زبان سے قریب‌تر - پرانی زبان اور تلفظ کی کچھ مثالیں نمونتہً پیش کی جاتی ھیں : کبھو ، نپٹ، وے انہوں سے، ایدھر ، کتیں = کے تئیں، ہووے = بروزن فعلن کہے تو = گویا ، رہ = ٹھہر توسہی

ع اجل کا پلاتا ہوں رہ تجھ کو جام، پاس = بمقابلہ، سامنے ع زبردست تھے گرد اس پاس پست

ع کہ رستم تھا ان پاس مانند زال ، نِت، اس ساتھ ، اس سوا ، گذرانیاں = گذرانیں ، روپا = روپیہ، باٹ = راہ

ع نہ اس طرح غم کی عبث باٹ لو

آنی = آنہی ،

ع نہ چنگا کبھی ہو یہ ناسور عشق

خوشی ساتھ، ع امیران وزیران تمھارے لئے

ع پری چل دھری جب پرستان میں ، ع لیا تخت میں کشور چین کا، ع نہ دیکھا تمہارا ما میں درمند ، ع پھر آخر دئے ان کو تسکین سب ، ع نہ جانا کبھی عشق کا میں مزا ، جہاں بیچ ، توئی = توھی ، ووھیں ، جیوں ، پُوتلے = پتلے ، چیکھیں = چکھیں ، سہج میں،

کبھی آگے بڑھتے کبھی بھاگتے
تمھاری شجاعت سے کب لاگتے

کرو راج و پاٹ ان کا سب لنڈ بھنڈ
کہ جسّے نہ باقی رہے کچھ گھمنڈ

سامھنے ، نہامھنے ،

ع جھلاواسی جھلتی تھی وہ مہ جبیں

نہ سہنے سکے، نہ رہنے سکے، دھواں (دھویں) سے، دانے (= دانا) سے -

اسلاء کی خصوصیات یہ ھیں کہ یائے ماقبل مفتوح کو ظاھر کرنے کے لئے ی کے اوپر ھندسہ ۸ کی شکل کا جزم ہے مثلاً مَیں ، ھَیں - واو ماقبل مفتوح کی بھی یہی صورت ہے مثلاً اَور ، یائے مجہول کو ظاھر کرنے کے لئے ی پر گول جزم ہے جیسے میں - لفظ کے آخر میں یائے معروف و مجہول میں فرق نہیں ہے ، مثلاً ھی = ہے شی = شے، بہت جگہ دو لفظوں کو ملا کر لکھا گیا ہے، مثلاً بنی جانکو ، ایکتماہ ، آسجا ، جسّے ، وھانکیا = وھاں کیا، کرونجنگ = کروں جنگ ، حنگو جدال = جنگ و جدال - ٹھ ، ڑ ، ڈ ، ٹ کو اس طرح لکھا ہے : آتھے ، گھر ، لڑائی، دانت = ڈانٹ

اغلاط املا بھی بہت جگہ ھیں، یہاں چند مثالیں کافی ہوں گی: گلذار = گلزار کھبی = کبھی ، سرعتاً = سرعتہً

اچھلتی وہ چھلتی (چھاتی) ٹھمکنے کے ساتھ
وہ پشواز و انگیا جھلکنے کے ساتھ

دنیاں = دُنیا -

اغلاط تلفظ بھی بکثرت موجود ھیں مثلاً انعام بروزن انام ، نَذر بجائے نذْر ،

عَدن = عدْن ، آل واعیال = آل وعیال، خرخواہ بروزن خرخہ ، آنار = انار ، رَمل = رمْل کے بجائے، پذیرہ بجائے پذیرا، آمرا = اَمراء، ارغنو = ارغنوں، زیادی بروزن زادی

ع ہوئی رات زیادی جہاں دار شاہ ،

قدر بجائے قدْر ، موسِقی = موسیقی ، کدرایَمن = کدارا ایمن، سِڑی کے بجائے سِری جو پورب کی زبان ہے، مہاراج دھراج = ادھیراج ، نقیب بروزن نَقب ، نقارہ بجائے نَقّارہ، طَرح = طرْح ، طرْف = طرَف ، ھشنگ = ھوسنگ ،

ع نہایت زور اور که جوں سیرنر

یعنی زور آور بروزن فعولن ، شرح = شرْح ، فتح = فتح ، مضطرب ، منتشر ، ٹوار = پتوار گل انداز = گولہ انداز، ترک و تاز = تُرکتاز

تلفظ کی یہ غلطیاں مؤلف کی کم لیاقتی پر نہیں بلکہ سہل انگاری ، ضعف تالیف اور نظم پر عدم قدرت پر محمول کرنی چاہئیں ورنہ مثنوی کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مؤلف کی فارسی کی قابلیت اس زمانے کے دستور کے مطابق اچھی تھی ، اور شاہنامہ سکندرنامہ وغیرہ پر اس کی نظر تھی۔ رزم و بزم کے ذکر میں کنور صاحب نے کافی زور بیان اور فارسی لغات پر عبور کا اظہار کیا ہے ۔ کہیں کہیں فارسی میں بھی چل نکلتے ہیں :

ز سہم سمندان پولاد نعل
تن مردماں شد ز خوں لعل لعل

تمام ضمنی حکایتوں کی سرخیاں فارسی میں ہیں مثلاً ” داستان فتح یافتن خاقان چین بجنگ شاہ روم و رسیدن وزیر بحضور شہنشاہ روم و بیان کردن احوال جنگ و باز آمدن بجنگ خاقان چین۔“ اسی طرح فارسی و اردو مثنویوں کے اسلوب کے مطابق ہر حکایت کے شروع میں ساقی کو مخاطب کر کے چند بیتیں لکھی ہیں مثلاً

پلا ساقیا ارغوانی شراب
بڑھے جسّے رخسار کی آب و تاب
دوگونہ ہوالحق نشے کی ترنگ
مہیا کروں ساز و اسباب جنگ

اور

پلا ساقیا بادۂ لالہ گوں
کہ ہے درپئے جنگ گردون دوں
یہ چرخ ستمگار سفاک ہے
زمیں قتل گہ ہے نہ یہ خاک ہے

کبھی قلم کو مخاطب کیا ہے اور چند عبرت آمیز اسعار حسب موقع چسپاں کئے ہیں ، مثلاً

چل اے اشہب خامہ ہو تیز گام
لکھوں کچھ صف جنگ کا میں کلام
زمانے کا بے طرح نیرنگ ہے
یہ چنگ فلک خارج آہنگ ہے
نہ یہ دھر دائم ہے اک طور پر
کرے ہے سبھوں کو یہ زیر و زبر
یہ چرخ ستمگار عیار ہے
سدا در پئے رنج و آزار ہے

(ص ۱۷ و ۱۸)

زبان کی خامیاں جیسا کہ اوپر اشارہ

کیا جاچکا ہے، بے شمار ہیں۔ یہاں بہت سی مثالیں وضاحت کے لئے دی جاتی ہیں - ع
ہوا وارد حال اسجاپہ آ بمعنی اس‌جا وارد ہوا
ع جب ایام دہ ماہ پورا ہوا - وے دو= وے دونوں - ع کہ لیجا تو اس میوہ کو بر محل یعنی محل میں لےجا - ع لئے اسلحہ جنگ کا ایک بار ، اطاعت کریں ہیں -

لگیں ہونے ازبس کہ خونریزیاں
تفاوت ہوا حفظ امن و اماں

سہمگیں بمعنی ڈراؤنا بجائے خوف زدہ۔
ع چنگھاڑ اور آہنگ کرتے رہے زچنگھاڑ کا تلفظاور آہنگ بمعنی شور غلط ہے)

ع کیا چاہئے جلد کچھ اس کی غور

لادھڑک ، ظفر (مذکر بجائے مؤنث) ، آسان گی= آسانی، وفائی بمعنی وفا۔

ع وفائی بھلا بے وفا میں ہے کب

زبس انکا ہے خاندان عالیہ
جہاں میں وہ ہے دودماں عالیہ
گھنا اک بیابان ذیشان میں

ع نثار عشق کا جان من کو کیا

اک بیک= یک بیک ، یکاایک= یکایک یا ایکا ایکی، مزاخوں= مذاقوں

ع سبب اس کا آپ ہم کو بتلائیے

زبان کی خامیوں ، تذکیر و تانیث کی غلطیوں ، شترگربہ ، تعقید لفظی و معنوی ، حشو و زوائد، صرف ونحو کی بےشمار فروگذاشتوں کے علاوہ کلام کئی جگہ مہمل اور بےمعنی‌بھی ہوگیاہے جس کی چند مثالیں کافی ہوں گی۔ ان مثالوں میں ناموزوں مصرعے بھی شامل ہیں :

معین ہر اک وقت معمول پر
حفاظت لگی ہونے معقول پر
چلا رزم گہ میں وہ اک بارگی
مقابل کیا جنگ کو بارگی

ع پلنگیں حو تھا سرور گردناں

قلمدان لے کے بہر جنگ تھا
نہ افکار میں ملک کے تنگ تھا

ع ووھیں حکمت ان گی نشر ہوگئی

بصد شان و شوکت مادب؟ کے ساتھ
سبھی آویں اپنے مراتب کے ساتھ
ہر اک تال کے پیچھے بجتی پرن
تھی خسرو اور؟ تھی تان سن کی دھرن
جو دیکھا تمھارا ہے صانع بلند
کیا حق تعالیٰ نے طالع بلند
وہ چکری تھی اور محفل جشن تھی
دو بالا وہاں منزل جشن تھی
بتاتی ہے پیچھے وہ یوں رنگ ڈھنگ
کہ دیتی ہے کھلوا کے پتلی سا رنگ

ان تمام کوتاہیوں کے باوجود مثنوی جنگ نامہ تاریخی ادبی اور لسانی اعتبار سے اہمیت سے خالی نہیں - گذشتہ صفحات میں مصنف اور مثنوی کا تعارف کرا دیا گیا ہے - تاہم اس خیال سے کہ اس مثنوی کا زیادہ گہرا مطالعہ ہوسکے جس کا یہاں سامان نہیں اور لغات اردو کے مدوّن تلاش اسناد میں اس سے استفادہ کرسکیں یہ کتاب ترقیٔ اردو بورڈ کو ہدیتہً بھیجی جارہی ہے -

رسالہ ”حسن“

(حیدرآباد کا ایک قدیم ماہوار علمی رسالہ)

نصیر الدین ہاشمی

گذشتہ ۷۰ سال کے عرصے میں حیدرآباد سے متعدد ماہوار علمی ادبی رسالے شائع ہوتے رہے ہیں، جن میں سے کئی ایک اردو کے معیاری رسالوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ انہی میں ایک رسالہ ”حسن“ بھی ہے۔ یہ رسالہ اگست سنہ ۱۸۸۸ء سے شائع ہونے لگا تھا اور سنہ ۱۸۹۰ء تک جاری رہنے کا پتا چلتا ہے۔

اس رسالے کے ایڈیٹر حسن بن عبداللہ المخاطب بہ عماد نواز جنگ تھے۔ یہ اولاً حکومت آصفیہ میں بارہ سو سواروں کے جمعدار (کمانڈر) تھے، پھر ۱۸۶۵ء میں قلمرو آصفی میں ایک ضلع میں انسپکٹر پولس بنائے گئے تھے۔ اس کے بعد ان کو سررشتۂ مال میں مستقل کر کے کلکٹر مقرر کیا گیا۔ کچھ عرصے تک پولس کے سکریٹری بھی رہے۔ مگر جلد ہی کلکٹری پر واپس ہو گئے۔ پھر کلکٹری سے ترقی پا کر مختلف اعلیٰ خدمات پر مامور ہوتے رہے۔ چنانچہ صدر محاسب (اکونٹنٹ جنرل)، ناظم بندوبست، ناظم آبکاری، انسپکٹر جنرل رجسٹریشن و اسٹامپ اور کسٹم کمشنر وغیرہ خدمات کو انجام دیتے رہے۔ حیدرآباد کے سرکاری باغات کی نگرانی بھی ان سے متعلق رہی۔ نواب اقبال الدولہ سروقارالامرا مدارالمہام (چیف منسٹر) کے زمانے میں ان کا تقرب حاصل رہا اور ان کے ہی زمانۂ مدارالمہامی میں ان کو اعلیٰ عہدے ملے۔ ایک ہزار ماہوار سے ترقی پا کر انیس سو ماہوار پر پہنچ گئے۔ انہوں نے یورپ اور ایشیا کے کئی ممالک کی سیاحت بھی کی تھی۔ علمی ذوق تھا اور خصوصاً تاریخ سے خاص شغف رکھتے تھے۔ جس وقت انہوں نے رسالہ ”حسن“ جاری کیا اس وقت صدر محاسب جیسی اہم خدمت پر مامور تھے۔ ایک حسابی سرشتے میں رہ کر ایک علمی رسالہ شائع کرنا ان کی

علمی دلچسپی اور ادبی ذوق کا ثبوت ہے۔ حکومت آصفیہ میں کسی عہدہ دار کو علمی کاموں میں حصہ لینے کی ممانعت نہیں تھی۔

جیسا کہ تذکرہ کیا گیا ہے، رسالہ ”حسن“ ایک ماہوار رسالہ تھا جو ۱۰×۲۵/۱ انچ سائز کے (۸۰) صفحات پر شائع ہوتا تھا۔ ایک عرصے تک اس کا ذاتی مطبع تھا، مگر اس کے بعد مطبع مفید عام آگرہ میں طبع ہونے لگا۔ اس رسالے کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ ہر ماہ سب سے اچھے مضمون کے مصنف کو ایک اشرفی معاوضہ بطور نذر دی جاتی تھی۔ رسالہ علمی اور اخلاقی تھا۔ اس لئے کوئی افسانہ یا نظم یا غزل اس میں شائع نہیں ہوتی تھی۔ جو مضامین شائع ہوئے ہیں ان میں تاریخ، سوانح، سفرنامہ، فلسفہ، سائنس جیسے موضوعات سے متعلق ہیں۔ رسالے کا حجم پانچ جز یعنی (۸۰) صفحے کا تھا۔ شائع ہونے والے مضامین کی تعداد کم سے کم ہوتی تھی۔ یعنی اکثر مضامین طویل ہوا کرتے۔ مولانا شرر کے رسالہ ”دلگداز“ کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس کے تمام مضامین مولانا کے ہی لکھے ہوئے ہوتے تھے۔ رسالہ ”حسن“ میں جو مضامین شائع ہوا کرتے تھے ان میں ایڈیٹر (حسن بن عبداللہ) کے مضامین اکثر ہوا کرتے بلکہ بعض مرتبہ ایک سے زیادہ مضامین بھی ان کے ہوتے تھے۔

اس رسالے کے مضمون نگاروں میں شمالی ہند کے اصحاب کا خاص حصہ رہا ہے۔ چنانچہ ان میں مولانا شبلی، مولانا حبیب الرحمن شروانی (صدر یار جنگ)، مولانا ذکاءاللہ، خواجہ غلام الثقلین وغیرہ وغیرہ نظر آتے ہیں۔ ان کے علاوہ علیگڈھ کے زیر تعلیم طلبہ بھی اس میں حصہ لیا کرتے تھے۔ چنانچہ مولوی ڈاکٹر عبدالحق مرحوم اور حامد علی خاں کے مضامین اس میں موجود ہیں اور ان کو متعلم علیگڈھ لکھا گیا ہے۔

رسالہ ”حسن“ کے مکمل فائل تو ہم کو دستیاب نہیں ہوئے البتہ نواب سالار جنگ کے کتب خانے میں مختلف سنین کے کئی شمارے موجود ہیں۔ ان ہی رسالوں کے لحاظ سے مضامین کی ایک فہرست پیش کی جاتی ہے۔ جس سے اس رسالے کے مضامین کا علم ہوسکتا ہے۔

جلد (۱) نمبر (۱) ماہ اگست سنہ ۱۸۸۸ء

اگرچہ یہ پہلا پرچہ ہے مگر کوئی تمہید یا رسالے کے اغراض و مقاصد وغیرہ کسی امر کی صراحت نہیں ہے۔ یکے بعد دیگرے سلسلہ وار ان رسالوں کے مضامین کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

(۱) سلطنت ایران کا ضروری حال
(۲) علم اللسان (اشرفی نذر کی گئی ہے)
سید علی بلگرامی۔ ہوم سکرٹری حیدرآباد
(۳) سکّے کا بیان —
(۴) فینانس —
(۵) زندہ آدمیوں کی سوانح عمری

ممکن ہے پہلا اور آخری تین مضمون بھی ایڈیٹر کے ہوں مگر کوئی صراحت نہیں ہے۔

جلد (۲) نمبر (۷) جولائی سنہ ۱۸۸۹ء

(۱) ہندوستان کی حرفت و صنعت قدیم
عماد نواز جنگ (ایڈیٹر)
(۲) النظر فی التاریخ (اشرفی نذر کی گئی)
غلام الثقلین
(۳) روز نامچہ سفر نیلگری — منیر الملک
(۴) قسطنطنیہ — میر لیاقت علی

جلد (۲) نمبر (۹) ستمبر سنہ ۱۸۸۹ء

(۱) والٹر کی حیرت افزا تاریخ — عماد نواز جنگ
(۲) قدیم زمانے کی حنوط کی ہوئی لاشیں
خیرالدین محمود جنگ
(۳) انتقال پرملال مہاراجہ نرندر پرشاد
راجہ کشن پرشاد
(۴) دیباچہ سوانح عمری نواب لائق علی خاں
رجب علی ایڈیٹر 'پنجاب ریویو'
(۵) قومی تعلیم — عماد نواز جنگ
(۶) سفر نامہ نیلگری — منیر الملک
(۷) مدرستہ العلوم مسلمانان علیگڈھ — ایضاً

جلد (۲) نمبر (۱۰) اکتوبر سنہ ۱۸۸۹ء

(۱) تجارت کی دلچسپ تاریخ — عماد نواز جنگ
(۲) مسلمانوں کے جوش و خروش کی سچی تصویر
محمد اصغر حسین
(۳) سفر نامہ نیلگری — منیر الملک
(۴) عربوں کے سویلیزیشن کی تاریخ
(اشرفی انعام دی گئی ہے)
محمد یوسف علی خاں قزلباش مالک و
ایڈیٹر 'آئینہ' ہند'
(۵) مسجد دمشق — عماد نواز جنگ
(۶) جرمنی کا جعلی پیغمبر — عماد نواز جنگ

جلد (۲) نمبر (۱۲) دسمبر سنہ ۱۸۸۹ء

(۱) الناس باللباس (اشرفی دی گئی ہے)
سید اقبال علی
(۲) حکومت — عماد نواز جنگ
(۳) سفر نامہ نیلگری — منیر الملک
(۴) انتظام محاصل اراضی مدراس
عماد نواز جنگ
(۵) ممتاز انگلو انڈین — محمد اصغر حسین

جلد (۳) نمبر (۵) مئی سنہ ۱۸۹۰ء

(۱) کتب خانہ اسکندریہ
مرزا علی حسین (لاہور)
(۲) دعوت افلاطون (اشرفی دی گئی)
محمد اصغر حسین
(۳) تاج محل آگرہ — عماد نواز جنگ
(۴) بیت الحکمت اندلس — سید جلال
(۵) انسانی طرز معاشرت پر قدرت کا اثر
محمد شیدا علی لکھنوی
(۶) تجارت — عماد نواز جنگ

جلد (۳) نمبر (۸) اگست سنہ ۱۸۹۰ء

(۱) بقیہ سوانح عمری بابر
مولوی حبیب الرحمن خان شروانی
(۲) اورنگ زیب کی پالیسی (اشرفی دی گئی)
مولوی محمد شیدا علی لکھنوی
(۳) بقیہ دعوت افلاطون — محمد اصغر حسین
(۴) بقیہ تاریخ اسپین
محمد حامد علی تلمیذ علیگڈھ
(۵) تقدیر و تدبیر — سید رحیم الدین

حلد (۴) نمبر (۳) مارچ سنہ ۱۸۹۱ء

(۱) ہندوستان میں کس قسم کے انشا پردازوں اور کس قسم کی انشاپردازی سے شائستگی اور آسودگی مل سکتی ہے۔ — محمد ذکا اللہ

(۲) یورپ میں اشاعت اسلام — عماد نواز جنگ

(۳) فوٹو گرافی — راجہ مرلی منوہر

(۴) حکیم سقراط کے مختصر حالات — سید جلال

اس رسالے میں ولیم کوبلم لور پول کا خط ''انگلستان میں اشاعت اسلام'' سے متعلق شائع ہوا ہے اور ترجمۂ قرآن شریف بہ زبان انگریزی کا تذکرہ ہے۔

جلد (۴) نمبر (۴) اپریل سنہ ۱۸۹۱ء

(۱) تذکرۂ تیمور — احمد سفیع

(۲) تاریخ اسپین — حامد علی

(۳) تیموریہ خاندان کے علوم و فنون — عماد نواز جنگ

(۴) حیات کویلم — ایضاً

جلد (۴) نمبر (۵) مئی سنہ ۱۸۹۱ء

(۱) ساکنان مدینہ قبل اسلام — مجیب احمد تمنائی

(۲) تاریخ اسپین — حامد علی سہارنپوری

(۳) صنعت و حرفت — عمادنواز جنگ

جلد (۴) نمبر (۶) جون سنہ ۱۸۹۱ء

(۱) ہرسہ۔ ڈارون کے حالات زندگی — محمد عبدالکریم خان گورگانی

(۲) انسانی جذبات — خلیل احمد اسرائیلی، مدرس اول علیگڈھ

(۳) صنعت و حرفت — عماد نواز جنگ

جلد (۴) نمبر (۷) جولائی ۱۸۹۱ء

(۱) سلطان بایزید یلدرم اور تیمور

(۲) بادشاہ گورگانی اور مسلمانوں کی مردہ پولیٹیکل حالت کی نسبت ایک خیال — سراج الدین احمد ایڈیٹر 'سرمور گزٹ'

(۳) صنعت و حرفت — عماد نواز جنگ

(۴) واعظان مسیحی کی ناکامیابیوں پر ایک نظر۔ ایک غیر مسیحی کی نظر سے۔ — یکے از مشتریان تجربہ کار

جلد (۴) نمبر (۸) اگست سنہ ۱۸۹۱ء

(۱) غبارے کا فلاسفرانہ بیان — مجیب احمد تمنائی

(۲) مضمون کیوں کر لکھیں — عبدالکریم خان

(۳) وسط یورپ — عماد نواز جنگ

جلد (۴) نمبر (۱۰) نومبر سنہ ۱۸۹۱ء

(۱) حقیقت‌الماس — مجیب احمد تمنائی

(۲) دخانی جہاز — عماد نواز جنگ

(۳) صرف خاص — ایضاً

(۴) عجائبات حیوانات ارضی — ایضاً

جلد (۴) نمبر (۱۲) دسمبر ۱۸۹۱ء

(۱) ہندوستان کے حیوانات کی تاریخ — عماد نواز جنگ

(۲) تاریخ اسپین — حامد علی

(۳) خلیفہ مستعصم باللہ — عماد نواز جنگ

جلد (۵) نمبر (۱۱) جنوری سنہ ۱۸۹۲ء

(۱) مذہب اور اخلاق — فار قلط

(۲) حالات حکیم ارسطا طالیس (اشرفی دی گئی ہے) — سید جلال

(۳) تاریخ حسن ''واقعات دکن''
عماد نواز جنگ
جلد (۵) نمبر (۳) مارچ سنہ ۱۸۹۲ء
(۱) آواز اور اس کی کیفیت
سید محی‌الدین حسین خاں
(۲) تاریخ گلبرگہ شریف عماد نواز جنگ
(۳) تاریخ حسن ایضاً
جلد (۵) نمبر (۴) اپریل سنہ ۱۸۹۲ء
(۱) ساعری سید محی‌الدین حسین خاں رضوی مدرس اعلیٰ علیگڈہ
(۲) کیا ترکی ترقی کر رہا ہے ابراہیم حسن بے
(۳) بقیہ تاریخ گلبرگہ عماد نواز جنگ
(۴) تاریخ حسن ایضاً
جلد (۵) نمبر (۵) مئی سنہ ۱۸۹۲ء
(۱) تاریخ کے مفید نتیجے محمد سریع‌الدین
(۲) تاریخ اسپن حامد علی
(۳) بیدر عماد نواز جنگ
جلد (۵) نمبر (۶) جون سنہ ۱۸۹۲ء
(۱) سلطان محمدخاں ثانی اور قسطنطنیہ کی فتح (اشرفی دی گئی ہے) عبدالحلیم شرر
(۲) سلاطین بریدیہ عماد نواز جنگ
جلد (۵) نمبر (۷) جولائی سنہ ۱۸۹۲ء
(۱) فرانس کا انقلاب عظیم عماد نواز جنگ
جلد (۵) نمبر (۸) اگست سنہ ۱۸۹۲ء
(۱) تذکرۃ‌المشاہیر عماد نواز جنگ
(۲) تاریخ اسپن حامدعلی خاں
(۳) حافظے کے عجیب و غریب افعال
عبدالکریم خاں آزاد

(۴) سوانح عمری امیر کبیر شمس‌الامرا
عماد نواز جنگ
(۵) تصویر کا دوسرا پہلو (خط) عبداللہ کوبلم
جلد (۵) نمبر (۹) ستمبر سنہ ۱۸۹۲ء
صرف ٹائیٹل ہے جس پر مندرجہ' ذیل مضامین کی فہرست ہے :
(۱) حقیقت‌القرطاس مجیب احمد تمنائی
(۲) سویلزیشن منشی رفیع‌الدین سعدی کا کوری
(۳) تاریخ اسپین حامد علی خاں
جلد (۵) نمبر (۱۰) اکتوبر سنہ ۱۸۹۲ء
(۱) معلم ثانی حکیم ابو علی سینا (اشرفی دی گئی ہے) سید جلال
جلد (۵) نمبر (۱۱) نومبر سنہ ۱۸۹۲ء
(۱) بقیہ تذکرۃ‌المشاہیر عماد نواز جنگ
(۲) شکاری پرند ایضاً
جلد (۵) نمبر (۱۲) دسمبر سنہ ۱۸۹۲ء
(۱) ہندوستان کا قیصری نظم و نسق
عماد نواز جنگ
جلد (۶) نمبر (۱) جنوری سنہ ۱۸۹۳ء
(۱) تاریخ جہاز رانی . احمد علی خاں
(۲) انگلستان کی صنعت و حرفت
مجیب احمد تمنائی
(۳) عقل اور اس کا استعمال سید احمد حسن
(۴) لور پول عبداللہ لور پول
جلد (۶) نمبر (۲) فروری سنہ ۱۸۹۳ء
(۱) سیزر قیصرہانی سلطنت روماۃ‌الکبرا
عماد نواز جنگ

(۲) وھابیوں کی فتح عرب میں اور ان کا استقبال
عبدالغفور خاں

جلد (۶) نمبر (۳) مارچ سنہ ۱۸۹۳ء

(۱) لکچر تجارت مسلمانان سابق و حال
عماد نواز جنگ

جلد (۶) نمبر (۴) اپریل سنہ ۱۸۹۳ء

(۱) سکندر اعظم کے حالات زندگی پر ایک محققانہ نظر (اشرفی دی گئی ہے)
مجیب احمد تمنائی

جلد (۶) نمبر (۵) مئی سنہ ۱۸۹۳ء

(۱) حالات زندگی سکندر اعظم ذوالقرنین
مجیب احمد تمنائی
(۲) زراعت و فینانس سید علی حسن لکھنوی

جلد (۶) نمبر (۶) جون سنہ ۱۸۹۳ء

(۱) کتب خانہ ھائے اسلامی
مولانا محمد شبلی نعمانی
(۲) حالات عمارات بیجاپور عماد نواز جنگ
(۳) تعلیم جبری مترجم محمد عبدالواحد

جلد (۶) نمبر (۷) جولائی سنہ ۱۸۹۳ء

(۱) علوم حکمت کے ترجمہ کے لئے گورنمنٹ نظام سے مودبانہ درخواست شرف الدین
(۲) سوانح عمری ڈاکٹر سموئیل چالس
احمد علی خاں

جلد (۶) نمبر (۸) اگسٹ سنہ ۱۸۹۳ء

(۱) غدر سنہ ۵۷ء شریف الدین
(۲) تذکرۃالمشاھیر عماد نواز جنگ
(۳) مراسم شادی آگرہ باسط علی خاں

جلد (۶) نمبر (۹) ستمبر سنہ ۱۸۹۳ء

(۱) تجارت و صنعت و علم و ھنر اسلامی
ابوالقاسم مولانا فضل رب قریشی
(۲) ایجادات اور اس کی ترقی و تنزل کے اسباب
عماد نواز جنگ

جلد (۶) نمبر (۱۰) اکتوبر سنہ ۱۸۹۳ء

(۱) اجرام فلکی کے تاثرت شریف الدین
(۲) بقیہ مراسم شادی آگرہ
محمد باسط علی خاں
(۳) بقیہ تذکرۃالمشاھیر عماد نواز جنگ

جلد (۶) نمبر (۱۱) نومبر سنہ ۱۸۹۳ء

(۱) عربوں کی گذشتہ تجارت
مجیب احمد تمنائی
(۲) بدھ کی زندگی کے مختصر حالات
محمد حشمت اللہ خاں
(۳) ابو نصر فارابی کے مختصر حالات
محمد احسان الدین
(۴) تذکرۃالمشاھیر عماد نواز جنگ

جلد (۷) نمبر (۱) جنوری سنہ ۹۴ء

(۱) ھندوستان اور قیصری حکومت
عماد نواز جنگ

جلد (۷) نمبر (۲) فروری سنہ ۹۴ء

(۱) اخلاق اور تمدن کی ترقی عماد نواز جنگ

جلد (۷) نمبر (۳) مارچ سنہ ۹۴ء

(۱) بقیہ اخلاق اور تمدن کی ترقی
عماد نوازجنگ
(۲) بقیہ تذکرۃالمشاھیر ایضاً

جلد (۷) نمبر (۴) اپریل سنہ ۹۴ء

(۱) سلطنت قیصری — عماد نواز جنگ

جلد (۷) نمبر (۵) مئی سنہ ۹۴ء

(۱) بقیہ سلطنت قیصری — عماد نواز جنگ

جلد (۷) نمبر (۶) جون سنہ ۹۴ء

(۱) قاہرہ کی مسجد عمر

عبدالحسن طالب‌علم مدرستہ‌العلوم علیگڈہ

(۲) سوانح عمری نواب عبداللطیف خاں

اے ۔ ایچ ۔ عاصم

نوٹ ۔ بنگال کے نواب عبداللطیف خاں ہیں جن کا کچھ تذکرہ رسالہ عصمت میں محترمہ شائستہ سہروردیہ نے کیا تھا ۔

جلد (۷) نمبر (۷) جولائی سنہ ۹۴ء

(۱) سلطنت روس — عماد نواز جنگ

(۲) محھلی کا بیان جنگ — ایضاً

جلد (۷) نمبر (۸) اگست سنہ ۹۴ء

(۱) سلطنت روس — عماد نوازجنگ

کتب خانہ نواب سالار جنگ میں اس قدر پرچے موجود ہیں ۔ ممکن ہے اگست سنہ ۱۸۹۴ء کے بعد رسالہ بند ہوگیا ہو ۔

ادارۂ ادبیات اردو میں رسالہ ''حسن'' کے صرف دو پرچے جلد (۵) کے موجود ہیں ۔ ان میں سے ایک جلد (۵) نمبر (۸) ہے جس کی صراحت اوارق گذشتہ میں کر دی گئی ہے ۔

جلد (۵) نمبر (۲) ماہ فروری سنہ ۱۸۹۴ء

(۱) سمندری عجائبات — عماد نواز جنگ

(۲) مشرقی باشندوں کے ساتھ سرکاری تعلقات — سر رچرڈ ھیمنز

(۳) طریقہ عمل برٹش ریذیڈنٹ رؤسائے ہندوستان سے — مسٹر سوڈر

اس تفصیل سے واضح ہوسکتا ہے کہ رسالہ ''حسن'' نے آج سے ستر سال پہلے اردو کی کیسی خدمت کی اور اس کے ذخیرے میں کن کن معلومات کا اضافہ کیا ۔ گذشتہ ستر سال کے اردو پرچوں میں رسالہ ''حسن'' کو معیاری حیثیت سے دوسرے رسالوں میں ایک طرح کی فوقیت دی جاسکتی ہے ، کیونکہ اس کے بعض مضمون نگاروں کو محنت کا معاوضہ ملتا تھا۔ گو یہ معاوضہ زیادہ نہیں ہوتا تھا مگر جب کہ عام طور سے کوئی معاوضہ مضمون نگاروں کو نہیں ملتا تھا، رسالہ ''حسن'' کا یہ اقدام اس کے بلند پایہ رسالہ ہونے کی دلیل ہے ۔

اس موقعے پر کسی مضمون پر تفصیلی بحث کرنے کا موقع نہیں ۔ اس مضمون سے یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ مشاہیر اردو مثلاً مولانا شبلی ، نواب صدریار جنگ ، مولانا عبدالحق ، خواجہ غلام‌الثقلین، مولانا عبدالحلیم شرر وغیرہ کے مضامین سے جن اصحاب کو دلچسپی ہو وہ اس رسالے کے مضامین سے مستفید ہوسکتے ہیں۔

سکونِ اوّل کا مسئلہ

(اسکول کے الف کی تحقیق)

سہیل بخاری

لفظوں کو ادا کرنے کا طریقہ جسے تلفظ کہتے ھیں زبان کے ساتھ ھی وضع ھوا ھے، اس لئے نہ کسی کو زبان کے اصول بدلنے کا اختیار ھے نہ تلفظ کو بگاڑنے کا حق ۔ انسان تلفظ کے معاملے میں بہت حسّاس ھوتا ھے اس لئے وہ جب کسی کو کوئی لفظ غلط بولتے ھوئے سنتا ھے تو فوراً ٹوک دیتا ھے یا اس پر ھنس پڑتا ھے ۔ زبان کسی فرد واحد کو اختراع و ابداع کا حق نہیں دیتی ۔ اس کا جمہوری مزاج کسی کی آمریت کو برداشت نہیں کرسکتا، لیکن جب بظاھر کوئی نیا اصول زبان میں اس طرح رائج ھوجائے کہ اسے بولنے والوں کی کثیر تعداد قبول کرلے تو وہ بھی ٹکسالی سکّے کی طرح چالو ھوجاتا ھے اور کسی کو اس پر اعتراض کا حق باقی نہیں رھتا ۔ اسی لئے ادیبوں نے غلط العام کو فصیح کا درجہ عطا کردیا ھے ۔

زبان میں تبدیلیوں کا موقع اس وقت آتا ھے جب اس کا سابقہ کسی دوسری زبان سے پڑتا ھے ۔ اس وقت زبانوں میں نہ صرف لفظوں اور معنوں ھی کا لین دین ھوتا ھے بلکہ بولنے والے غیر زبان سے لئے ھوئے الفاظ کو اپنی زبان کے صوتی اصولوں کے مطابق بولنے بھی لگتے ھیں ، مثلاً اردو میں عربی لفظ کَلمہ کو کل ۔ مہ اور عَربی کو عر ۔ بی بولتے ھیں ۔ اس کی وجہ یہ ھے کہ اردو کے تمام الفاظ ارکان پر مشتمل ھوتے ھیں اور ھر رُکن دو یا تین اصوات صحیحہ سے مرکب ھوتا ھے جن میں سے پہلا حرف متحرک اور آخری ساکن رھتا ھے ۔ یوں ھر رکن ایک حرکت اور ایک سکون یا دو حرکات اور ایک سکون سے بنتا ھے ، مثلاً چل ۔ چلَن وغیرہ ۔ دوسری زبانوں کے الفاظ بھی اردو میں اسی طرح ارکان میں تقسیم کرکے بولے جاتے ھیں۔

یہی وجہ ھے کہ عربی کے لفظ شمع اور طرح کو جن میں آخری حرف متحرک ھے ھم دو حرکات اور ایک سکون سے شَمَع ا طَرَح بولتے ھیں اور طَرَح کا تلفظ تو اردو ادب میں بھی قبول کرلیا گیا ھے ۔ اس اصول کی مثالیں ھمیں دوسری زبانوں سے بھی ملتی ھیں،

مثلاً پنجابی میں فارسی کے درخت ، دوست ، گوشت کو نہ صرف عوام بلکہ پڑھے لکھے بھی اسی طرح ارکان میں تقسیم کرکے در۔خت، دو۔ست ، گو۔شت بولتے ھیں۔ چنانچہ یہ نہ صرف اردو زبان کا بلکہ پاک و ھند کی تمام زبانوں کا بنیادی صوتی اصول ہے جو ان زبانوں کے ساتھ ساتھ ھی وضع ھوا ہے، لیکن جو لوگ اردو زبان کے مزاج سے واقف نہیں ھیں وہ اس قسم کے لفظ پر معترض ھوئے اور اصرار کرتے ھیں کہ یہ الفاظ ھماری زبانوں میں بالکل اسی طرح بولے جائیں جس طرح فارسی عربی میں مستعمل ھیں۔

اس ضمن میں انگریزی کے الفاظ ٹکٹ، پرمٹ اور منٹ وغیرہ کا ذکر بھی ضروری ہے۔ یہ الفاظ انگریزی میں کسرہ ماقبل ٹ کے ساتھ سنائی دیتے ھیں ، لیکن جب اردو میں مستعار لئے گئے تو ان کا زیر زبر سے بدل دیا گیا اور اب یہ بے تکان ٹکٹ ، پرمٹ ، منٹ بولے جاتے ھیں ، کیونکہ اردو الفاظ کی کثیر تعداد کا تلفظ اسی طرح کیا جاتا ہے جیسے آھٹ ، گھبراھٹ ، تلپٹ ، چوکھٹ ، سنکٹ ، جھنجھٹ ، کوڑا کرکٹ ، چنّٹ ، پلٹ ، بکٹ ، رھٹ ، کروٹ ، چھٹ ، لپٹ وغیرہ۔ اب اگر معترض یہ کہے کہ اردو والے ٹ سے پہلے زیر کیوں نہیں بولتے یا اردو کا نقاد یہ فیصلہ صادر کردے کہ اھل اردو ٹ سے قبل زیر بول ھی نہیں سکتے تو میرے نزدیک یہ اعتراض اور یہ فیصلہ دونوں عجلت فکر کا نتیجہ ھوں گے۔

کیونکہ اردو میں پٹ (پٹنا) ، چٹ ، مٹ ، جیسے الفاظ بھی موجود ھیں۔ اسی طرح جب پنجابی میں انگریزی کا منِٹ سکون ما قبل ٹ کے ساتھ منْٹ بولا جاتا ہے تو معترض کو اعتراض سے قبل یہ سوچ لینا چاھئے کہ تلفظ کا یہ طریقہ بھی ھماری زبانوں کے مزاج کے بالکل مطابق ہے اور اس تلفظ کے اجتماعی چلن کے پس پشت کوئی اصول ضرور کارفرما ہے کہ ان میں نون بالاعلان ، نون غنّہ سے بدل جاتا ہے جیسے منڈ اور مونڈ۔ پنڈ اور پینڈ۔ ڈنڈ، ڈانڈ۔ چنانچہ ھمارے یہاں منڈ، پنڈ، ڈنڈ، دھند (غبار) ، پھند جیسے الفاظ جن میں نون بالاعلان درمیانی حرف ھوتا ہے کثیر تعداد میں پائے جاتے ھیں جن پر قیاس کرکے انگریزی منِٹ کو منْٹ بولا جاتا ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ انفرادی تلفظ میں غلطی کا امکان ھوتا ہے لیکن زبانوں کا اجتماعی تلفظ کسی نہ کسی دیسی بدیسی اصول یا روایت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

انگریزی کا لفظ سکول (School) جو اردو میں مستعار لفظ کے طور پر اسکول بولا جاتا ہے، اسی ذیل میں آتا ہے کیونکہ تمام اھل اردو اس کو اسی طرح بولتے ھیں اور اس کا یہ اجتماعی تلفظ اس امر کا ثبوت ہے کہ اس کو کسی نہ کسی اصول کی پشت پناھی حاصل ہے۔ بظاھر یہ لفظ کچھ عجب سا ہے

یا یوں کہئے کہ لفظوں کی یہ قسم عجیب سی ہے جس کی ابتدا میں دو حروف صحیحہ پے در پے آتے ہیں، کیونکہ آج اس برصغیر میں جتنی زبانیں بولی جارہی ہیں ان میں سے کسی ایک سے بھی بنیادی مادے کی کوئی ایسی مثال نہیں مل سکتی جس میں ابتدائی حرف صحیح ساکن ہو اور جس میں دو حروف صحیحہ کے درمیان حرف علت نہ بولا جاتا ہو۔ چنانچہ اس برصغیر کی کسی زبان میں بھی لفظ سکول (School) کا تلفظ سین ساکن سے نہیں کیا جاسکتا۔ لہذا اس کے صحیح تلفظ کے لئے ہمیں دوسری مثالیں دیکھنی چاہئیں۔

انگریزی اور یورپ کی دوسری زبانوں بالخصوص ہندیورپی زبان کی تمام شاخوں میں ایسے لاتعداد الفاظ پائے جاتے ہیں جن میں مرکب حروف صحیحہ استعمال ہوتے ہیں اور الفاظ کے بنیادی اجزا یعنی مادوں میں بھی ان کی کوئی کمی نہیں ہے۔ مثلاً انگریزی فریم (Frame)، کراس (Cross) گلاس (Glass) یا سنسکرت پران، شلش (=فارسی سرش، سریش) وغیرہ لیکن ایسے الفاظ کو اس برصغیر کی قریب قریب تمام زبانوں میں پہلے دو حروف صحیحہ کے درمیان ایک زیر داخل کر کے فِریم، کِراس، گِلاس، پِران، شِلش بولا جاتا ہے، یعنی ہماری زبانوں کا یہ ایک عام اصول ہے کہ بدیسی زبانوں کے ایسے الفاظ کا تلفظ جن کی ابتدا میں پے درپے دو حروف صحیحہ آتے ہیں، ان کے درمیان حرکت کسرہ داخل کر کے کیا جاتا ہے، کیونکہ ان زبانوں میں ہر لفظ کا ابتدائی حرف متحرک ہوتا ہے۔ اس اصول کی رو سے انگریزی سکول (School) کا بھی اردو تلفظ سِکول ہونا چاہئے تھا۔ اس لئے مروجہ تلفظ اسکول بظاہر غلط سامعلوم ہوتا ہے جس کا سبب ہمیں کہیں اور تلاش کرنا ہوگا۔

اے۔ آر۔ ڈائمنڈ نے اپنی کتاب "ہسٹری اینڈ اوریجن آف لینگوئج" مطبوعہ لندن ۱۹۶۰ء کے صفحہ ۱۸۶ پر لکھا ہے کہ دنیا کی کسی زبان کے بنیادی مادّے میں دو حروف صحیحہ علی‌الاتصال نہیں آتے بلکہ ان میں ہر حرف صحیح کے بعد ایک حرف علت ضرور آتا ہے۔ اس سے صرف ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے اور وہ یہ کہ انگریزی میں یا ان ہند یورپی زبانوں میں جن سے یہ لفظ انگریزی نے مستعار لیا ہے اس کی مکتوبی صورت کچھ بھی کیوں نہ ہو اس کا حقیقی تلفظ وہ نہیں ہے جو آج اس کے مکتوبی روپ کو دیکھ کر کیا جا رہا ہے۔ اس لئے بہتر یہ ہوگا کہ اس کے ابتدائی مکتوبی روپ کا سراغ لگایا جائے تاکہ ڈائمنڈ کے قول کی صحت کا بھی علم ہو اور اس کے صحیح تلفظ تک پہنچنے میں بھی مدد مل سکے۔

انگریزی زبان میں ہند یورپی زبانوں کے ایسے بہت سے الفاظ رائج ہیں جن میں ابتدائی سین ساکن نظر آتا ہے لیکن یورپ کی دوسری زبانوں میں ان سے قبل ایک ای (e)

یعنی الف مکسورہ زیادہ ملتاہے بلکہ فرانسیسی ہے اور اس کی جگہ صرف e ہی نظر آتی ہے میں تو بیشتر ابتدائی سین ساقط ہی ہوجاتا مثلاً

انگریزی	معنی	ہسپانوی		فرانسیسی	
Scale	چڑھنا	Escalera	(سیڑھیاں)	Escalier	(سیڑھیاں)
Scribe	لکھنا	Escribir		Ecrire	
Scout	اسکاؤٹ	Escuchar	(سننا)	Ecouter	(سننا)
School	اسکول	Escuela		Ecole	
Spain	ہسپانیہ	Espana	(اسپانیا)	—	
Spanish / Spaniard	ہسپانوی	Espanol		Espagnol / Espagneul	قدیم فرانسیسی
Spirit	روح	Espíritu		Esprit	
State	ملک ۔ حالت	Estado		Eta	
Star	ستارہ	Estrella		Etoile	
Student	طالب‌علم	Estudiante		Etudiant	
Study	مطالعہ کرنا	Estudier		Etudier	
Strange	عجیب	Extrano		Etrange	

مندرجہ بالا الفاظ کے علاوہ انگریزی اور ہسپانوی کی مزید مثالیں یہ ہیں :— اب انگریزی اور فرانسیسی کے کچھ مشترک الفاظ ملاحظہ فرمائیے :

انگریزی	معنی	ہسپانوی
Special	خاص	Especial
Species	نوع	Especie
Spouse	شوہر	Esposo
Splendid	شاندار	Esplendido
Stable	مضبوط	Establo
Spectacle	نظارہ	Esepctaculo
Spiritual	روحانی	Espiritual
Spectator	تماشائی	Espectador
Skeleton	ڈھانچہ	Esqueleto
Station	اسٹیشن	Estacion
Style	طرز	Estilo
Studio	اسٹوڈیو	Estudio
Stampede	بھگدڑ	Estampida
Stomach	پیٹ	Estomago
Stupendous	عظیم ۔ بزرگ	Estupendo

انگریزی	معنی	فرانسیسی
Screen	پردہ	Ecran
Scroll	طومار	Escroe
Stanchion	کھڑی سلاخ	Estance
Scholar	عالم	Ecolier
Spinach	پالک	Ep·nards
Standard	معیار	Estandard
Stuff	مال۔سامان	Etoffe / Estoffe (قدیم)
Staple	خاص	Estaple قدیم
Sturdy	مضبوط	Estourdi (قدیم بمعنی حیران)
Spy	جاسوس	Espion
Squire	سرکس کا سوار	Ecuyer
Squirrel	گلہری	Ecureuil
Stranger	اجنبی	Etranger

ایک ھی زبان انگریزی میں بھی ایسے الفاظ کے جوڑے ملتے ھیں جن میں سے ایک میں ابتدائی سین موجود ھے اور دوسرے میں اس سے قبل e یعنی الف مکسورہ کا اضافہ ھوا ھے جیسے Special(خاص)اورEspecially(خاص طور پر) State اور Estate - Stable (مضبوط) اور Establish (جمانا) - Spy (جاسوس) اور Espionage (جاسوسی کا پیشہ) اور Espial (جاسوسی) - Strange (اجنبی، غیر) اور Estrange (غیر بنانا) - Scape (حس پر اپنا الزام ڈال دیا جائے) اور Escape (فرار) ۔ Scallop (ایک قسم کی مچھلی) اور Escallop - Scarp اور Escarp (سخت ڈھلان) - Scot اور Escot (ٹیکس) ۔ Scroll (طومار) اور Escrow - Seudo اور Escudo (ایک سکے کا نام)- Sparta (ایک ملک کا نام) اور Esparto (اسپارٹا سے موسوم ایک قسم کی گھاس) - Squire اور Esquire (تعظیمی لفظ - صاحب) وغیرہ

ھند یورپی زبانوں میں ابتدائی e (الف مکسورہ) کو hi اور si سے بھی ظاھر کیا گیا ھے کیونکہ ان کے عام اصول کے مطابق ابتدائی S کا تبادل h سے ھوجاتا ھے لیکن h کی آواز تلفظ میں مطلق نہیں نکلتی مثلاً انگریزی honour (آنر - عزت)، hour (آور - گھنٹہ)، honest (آونیسٹ - ایماندار) ، heir (ایر - وارث)، Hebrew (ایریو - عبری، عبرانی) - فرانسیسی habile ، انگریزی able (قابل) - یونانی و انگریزی hero ، فرانسیسی heros (ایرو) ، ھسپانوی heroe (ایرو) - لاطینی و انگریزی Hispania، ھسپانوی Hispana (اسپانیا)- لاطینی histrio، یونانی historia، انگریزی history، story، فرانسیسی histoire (استوئر)، ھسپانوی historio (استوریو) ، یونانی stat ، سنسکرت ستھات، فارسی جدید استاد - لاطینی sto، sisto (کھڑا ھونا)، سنسکرت ستھا، فارسی جدید ستا، استا۔ سنسکرت ستھامی (میں کھڑا ھوتا ھوں) یونانی استیمی histemi، فارسی جدید استم، ایستم وغیرہ۔

ابتدائی س سے قبل الف مکسورہ کے اضافے کے علاوہ ان زبانوں میں س کے بعد زیر کے اضافے کا ایک دوسرا رجحان بھی عام طور پر ملتا ھے مثلاً یونانی sphaira فارسی سپہر، انگریزی stalk (تنہ) ، فارسی جدید ستاک ، ستاخ - انگریزی star ، فارسی جدید ستارہ - سنسکرت سُتتی (تعریف) ، فارسی جدید ستودن (تعریف کرنا) ستائش (تعریف) انگریزی study (علم حاصل کرنا) ، فارسی جدید ستدن (حاصل کرنا-لینا) انگریزی spur (مہمیز) فارسی جدید سپر (ڈھال) - انگریزی stamp (دبانا- کچلنا) ، فارسی جدید ستم وغیرہ -

مندرجۂ بالا مثالوں کے علاوہ کافی تعداد ایسے الفاظ کی بھی پائی جاتی ھے جن کی دوھری دوھری شکلیں دونوں اصولوں کی پابندی کرتی ھیں مثلاً سنسکرت ستھا (کھڑا ھونا) فارسی جدید ستادن، استادن۔ انگریزی star ، سنسکرت ستر، اوستاستار، بلوچی، استار، کردی استرک، فارسی جدید ستارہ - سنسکرت شویت (سفید) ، اوستا سپئیت ، پھلوی سپیت ، فارسی جدید اسپید ، سپید - سنسکرت ستھور (مضبوط) ، بلوچی استور- یونانی spathe (لکڑی کی تلوار) ، ھسپانوی

espada (تلوار)، انگریزی spade (پھاؤڑا)، اوستا سپاد (فوج)، فارسی جدید سپاہ - یونانی spongggia، انگریزی sponge، spunge، فارسی جدید اسپنج - انگریزی spinach، spinage، قدیم فرانسیسی espinache، فارسی جدید سِپاناخ، اِسپاناخ، اِسپناج - فارسی جدید سِپند، اِسپند - سنسکرت ستھا (کھڑا ہونا)، فارسی جدید سِتادن، اِستادن - سنسکرت ستھان (مقام) انگریزی stand، فارسی جدید سِتان (جیسے بوستان = بو + سِتان)، اِستان (جیسے گلستان = گل + اِستان، شبستان = شب + استان، ریگستان = ریگ + استان وغیرہ) - انگریزی station، فرانسیسی اور فارسی جدید استاسیون وغیرہ -

کالڈ ویل نے اپنی کتاب "دراوڑی زبانوں کی تقابلی گرامر" کے صفحات ۷۹، ۸۱ پر لکھا ہے کہ تامل میں انگریزی سکول کو اسکول اور سنسکرت ستری کو استری بولا جاتا ہے - یہی اصول ہنگری اور فن لینڈ وغیرہ ممالک کی زبانوں میں بھی عام ہے - بیستون کی تختیوں پر سپارٹا کی جگہ اسپارٹا لکھا ہوا ہے - وہ میکس مُلر کے حوالے سے کہتا ہے کہ لاطینی میں بہت سے الفاظ س + ک، س + ت، س + پ کے مرکبات سے شروع ہوتے ہیں- لیکن چوتھی صدی عیسوی کے لاطینی کتبوں میں ان سے قبل الف مکسورہ کا اضافہ ہوگیا ہے - یہی بات ہمیں اس برصغیر کے قدیم ادب میں بھی ملتی ہے - پراکرت کے گرامر نویسوں نے الف مکسورہ کے اس اضافے کو اپنی اپنی گرامروں میں سؤر بھکتی کے نام سے موسوم کیا ہے اور سنسکرت لفظ ستری کا ایک پراکرت روپ اِتّھی بھی دیا ہے -

میرے نزدیک مندرجۂ بالا مثالیں یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ اردو زبان میں ہند یورپی لفظ کے ابتدائی مرکب حروف صحیحہ کے درمیان زیر کا اور ابتدائی ساکن صغیوری سے قبل الف مکسورہ کا اضافہ اردو زبان کی اپنی ایجاد نہیں ہے بلکہ خود ان ہیں ہند یورپی زبانوں کا اصول ہے، جس کا چلن اس برصغیر میں نہایت قدیم زمانے سے چلا آرہا ہے۔ لہذا اہل اردو جو سکول کو اسکول سٹیشن کو اسٹیشن اور سٹول کو اسٹول بولتے ہیں، اسی ہند یورپی زبان کے اصول کی پیروی کرتے ہیں جس سے یہ الفاظ اردو میں مستعار آئے ہیں، اور پاک و ہند کی زبانوں کے اس عام دستور پر عمل پیرا ہیں جو ہزاروں سال سے جاری ہے -

مولوی محمد شفیع مرحوم

ولادت : قصبه قصور ۱۸۸۳ء
وفات : لاهور ۱۹۶۳ء

سید ہاشمی فرید آبادی

راقم‌الحروف کو اپنے زمانے کے متعدد مشاهیر سے شرف نیاز حاصل هوا اور تریب سے دیکھنے کا موقع ملا - '' مشاهیر '' سے محض شہرت یافتہ مراد نہیں بلکہ وہ حضرات جو اپنے علم و فضل ، بلند پایہ تصانیف ، یا قومی خدمات کی بنا پر ممتاز و سر بلند ہوئے۔ مسلمانوں میں عام کمزوری یہ دیکھی گئی ہے کہ مزاج پر قابو نہیں رکھتے ، اچھے اچھے ذی علم اور معزز حضرات وقتی جذبات سے مغلوب هوجاتے هیں - اس کا اثر لامحالہ ان کے کاموں میں ظاہر ہوتا ہے - صرف چند صاحبوں کو دیکھا کہ جس طرح کام کی کثرت ان کے انضباط اوقات میں خلل نہ ڈال سکتی تھی ، اسی طرح کسی دشواری، ناکامی، ناگواری کی صورت میں ان کے اعتدال و استقامت میں فرق نہ آتا تھا۔ ان صفات کی ایک مثال، موضوع تحریر مولوی محمد شفیع مرحوم ، سابق استاد و صدر اورنٹل کالج ، حال صدر شعبۂ دائرہ معارف اسلامیہ ، لاهور تھے۔ مرحوم کی سیرت وسوانح پر ان کے عمر بھر کے رفیق، شاگرد، جانشین کلیہ ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب نے اردو اور انگریزی میں وفات کے بعد بھی لکھا اور حین حیات بھی مرحوم کے علمی احسانات کی یادگار کے طور پر مقالات علمیہ کی ایک ضخیم کتاب مرتب کر کے نذر گزرانی ('' ارمغان علمی '' طبع لاهور ۱۹۵۵ء)۔ صحیح معنی میں مرحوم سے عقیدت مندی اور ان کی مرتبہ شناسی کا حق ادا کیا۔

کاتب سطور تقسیم هند کے بعد ، اپنے قیام لاهور کے ۱۰ ، ۱۲ سال مرحوم کے ساتھ کام کرنے اور ان کی مسلسل عنایات و الطاف سے بہرہ مند رہا۔ اپنے علم و نظر کی رسائی تک کہہ سکتا ہے کہ اسلامیات یعنی عربی ، فارسی نیز ترکی اور اردو علوم ، تاریخ ، جغرافیہ، تذکرہ، ادبیات ، فقہ وغیرہ سے اتنی جامع واقفیت پاکستان و هند ایک طرف دوسرے اسلامی ممالک میں بھی شاید هی کسی کو نصیب ہو گی جیسی مرحوم مولوی محمد شفیع کے حصے میں آئی تھی - اس کی سب سے روشن اور بدیہی شہادت '' دائرہ معارف اسلامیہ اردو '' (یعنی انسائکلوپیڈیا اوف اسلام کا ترجمہ مع

اضافہ و ترمیم) دنیا کے سامنے ہے۔ اس ضخیم قاموس کا انگریزی متن کم و بیش پانچ ہزار (۲خانہ ۷۰ سطری) مطبوعہ صفحات پر محتوی ہے ۔ اردو میں سولہ سترہ ہزار بڑی تقطیع کے صفحات سے کم پر طبع نہ ہوگا۔ ترجمہ بہت سے لائق اور مشاق مترجمین سے کرایا گیا اور متعدد تجربہ کار اہل علم نے اس کی نظر ثانی کی، لیکن ہر ترجمے کی آخری صحت۔ایک ایک لفظ کا انگریزی متن سے، ہر اصل ماخذ سے، مقابلہ، جگہ جگہ ترمیم ، تحشیہ ، اضافہ ، یہ ساری ذمہ داری تنہا مولوی محمد شفیع مرحوم نے اٹھائی ۔ اتنی طول طویل، ہزارہا موضوعات کی کتاب کا ترجمہ، نظرثانی اور طباعت کے انتظامات ھی بجائے خود ایسی غیرمعمولی مشقت، مستعدی نگرانی اور اعلیٰ تنظیمی قابلیت کے متقاضی تھے کہ ہماری قوم کے افراد میں یہ صفات شاذ و نادر ھی یکجا دیکھی گئی ھیں، لیکن اس کے بعد جیسی عالمانہ تحقیق ، ناقدانہ بصیرت و ژرف نگاھی سے مرحوم نے یہ علمی کام انجام دیا وہ فی الواقع حیرت انگیز اور انکی کرامت کہا جائے تو شاید بےجا نہ ہوگا ۔ بہر حال مولوی محمد شفیع کا اردو اور اسے قومی زبان سمجھنے والوں پر یہ ایسا ابدی احسان ہے کہ خود وہ بھول جائیں یا مٹ جائیں تو بھی غالباً مسلمانوں کی ثقافتی تاریخ سے کبھی محو نہ ہوگا۔

مرحوم کی دوسری گرانقدر علمی خدمات (تصانیف ، مقالات ، مدّونات ، تحشیہ کتب وغیرہ) کی طولانی فہرست محولہ کتاب ''ارمغان'' کے مقدمے میں فاضل مرتب نے فراہم کردی ہے۔ نشری تقریروں کے دو مجموعے ('' مقالات علمی و دینی'' لاہور، ۱۹۶۱) بعد میں شائع ہوئے اور اپنی بیش بہا معلومات کے اعتبار سے ہر مسلمان کے پڑھنے کے لائق ھیں۔ اعلیٰ اعلیٰ مغربی تعلیم پانے اور یورپی اساتذہ سے اتنا کچھ فیض اٹھانے کے باوجود مولوی محمد شفیع اپنے سنت والجماعت عقائد میں ایسے راسخ اور پابند صوم و صلواۃ مسلمان تھے کہ '' نئی روشنی'' والوں میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے ۔ برشبہ وہ یورپ کے مستشرقین ، ان کے بے پایاں شوق علم و تحقیق ، اسلامی نوادر مخطوطات کی تلاش و فراھمی، پھر کمال دیدہ ریزی سے تصحیح و طباعت کے سچے قدرشناس تھے ۔ انسائیکلوپیڈیا اوف اسلام ان مغربی اہل علم کی مشترکہ سعی کا بےمثال کارنامہ ہے۔ اس کے اردو ترجمے کی تحریک مرحوم ھی کے انتخاب اور کوشش سے عملاً صورت پذیر ہوئی۔ اس کتاب کے اکثر مضامین یقیناً اسلامی تعلیمات اور بزرگان اسلام پر تعریضی رنگ میں لکھے گئے ھیں ۔ چنانچہ مصری (عربی) ترجمے میں بہت کچھ اصل متن حذف و اختصار سے کام لینا پڑا۔ لاہور کے تعلیم یافتہ مسلمان بھی اول اول ان مضامین کو دیکھ کر بھڑک گئے تھے ، لیکن ھمارے مرحوم محقق کو جہاں علمائے یورپ کی محنت سے پورا استفادہ کرنا منظور تھا، وھاں ان کی تحریروں

میں اسلام دشمنی کا یہ پہلو برابر نگاہ میں رہا اور ان اسقام کی خواہ علمی تھے ، خواہ عنادی اس خوبی سے اصلاح کی گئی کہ بعض نامی مستشرقین کا پول بھی از خود کھل گیا۔

تفصیلی گفتگو کی یہاں گنجائش نہیں شاید کوئی زمانہ آئے گا جب اس کام کی قدر و منزلت اور مرحوم کی علمی عظمت قوم کی سمجھ میں آئے گی۔

دعائے مغفرت اور اپنے مختصر قطعۂ تاریخ وفات پر ختم کرتا ہوں :-

کیا تیر گی ہے علم کے مطلعے پہ دیکھنا
یہ مولوی شفیع کا روز وفات ہے
اس فاضل جلیل کی تاریخ ارتحال
ہاتف پکار اٹھا کہ "الفضل مات" ہے!

۱۳۸۲ ھ

ترقی اردو بورڈ کی ایک قابل مطالعہ کتاب

جذبات نادر

حصہ اول و دوم نیز مثنوی لالہ رخ یک جلد
نادر علی خاں نادر کاکوروی (متوفی ۱۹۱۲ء) کے
جدت آفریں کلام کا مجموعہ - دیدہ زیب طباعت

مع مقدمہ

از جناب ممتاز حسن

ناشر : اردو اکیڈمی (سندھ) کراچی

قیمت مجلد مع گردپوش، دس روپے

لغاتُ الاضداد

محمد اقبال سلمان

آردو زبان میں معانی کے لحاظ سے کئی قسم کے الفاظ مروج ھیں۔ اس میں ایسے الفاظ بھی ھیں ، جن کا ایک ھی مطلب لیا جاسکتا ھے ، جیسے کمرہ ، جزیرہ ، باورچی اور اخبار وغیرہ۔ ایسے الفاظ بھی ھیں ، جن کے دو دو معنی مشہور ھیں۔ مثلاً کف ، جس کے معنی جھاگ بھی‌ھیں اور تلوا یا ھتیلی بھی۔ تال ، تالاب کے معنوں میں بھی آتا ھے اور وزن موسیقی کے معنوں میں بھی ۔ مغرب کے معنی مقام غروب کے بھی ھیں اور شام کے معنوں میں بھی مستعمل ھے ۔ سونا ، نیند کو بھی کہتے ھیں اور پیلے رنگ کی دھات کو بھی ، جس کے زیور بنتے ھیں ۔ اصطلاح میں ایسے الفاظ کو ''ذومعنیین'' کہا جاتا ھے ۔ اس کے علاوہ اردو میں کثیرالمعنی الفاظ بھی کثیر تعداد میں پائے جاتے ھیں ۔ ھاتھ، رنگ، آئینہ ، پانی وغیرہ کو بطور مثال پیش کیا جاسکتا ھے ، جو محاوروں میں آکر بیسیوں معنی دیتے ھیں ۔

الفاظ کی ایک اور قسم بھی ھے ، جسے 'لغت الاضداد' کہتے ھیں، یعنی، وہ الفاظ جو دو متضاد معنی دیتے ھوں۔ ایسے الفاظ اگرچہ تعداد میں بہت کم ھیں ، لیکن ان کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ۔ ذیل میں چند لغات الاضداد پر ، جو عام طور پر اردو میں مستعمل ھیں ، روشنی ڈالی جاتی ھے :

باختر : مخفف ھے ''بااختر'' کا۔ مشرق اور مغرب دونوں معنوں میں استعمال ھوتا ھے۔ فرھنگ انندراج میں ھے ''باختر بمعنی مغرب و خاور بمعنی مشرق۔ بخلاف نیز گفته‌اند۔ چنانکه فردوسی گفته :

چو مہر آورد سوئے خاور گریغ
هم از باختر بر زند باز تیغ

انوری بعکس گفته :

دی ز خاک خاوراں چوں ذرہ مجهول آمده
گشته امروز اندرو چوں آفتاب خاوری

تحقیق آنست که باختر مخفف بااختر است واختر ماه و آفتاب هردو را گوئند۔ پس باختر مشرق و مغرب را تواں گفت ۔ ازیں جهت متقدمین هر دو معنی این لفظ را استعمال کرده اند ۔''

فرھنگ نظام نے بھی اسے لغت‌الاضداد قرار دیا ھے : '' در فارسی گاھے بمعنی مشرق و گاھے بمعنی غرب آمده۔ دریں بیت فردوسی بمعنی مشرق است و خاور مغرب است :

چو مہر آورد سوے خاور گریغ
هم از باختر بر زند باز تیغ

لامعی کے حسب ذیل شعر میں بمعنی مغرب استعمال ہوا ہے :

جہاں را بشمشیر چوں تیر کردی
سپہ بردی از باختر تا بخاور

یہ شعر سلطان محمود غزنوی کی مدح میں ہے ، جس نے ہندوستان میں کئی فتوحات حاصل کیں ۔ پس خاور سے مراد مشرق ہے (یعنی ہند)٭ اور باختر سے مغرب ہند یعنی خراسان ۔

تاہم بعض اہل لغت نے اس سے اختلاف بھی کیا ہے ۔ چنانچہ فرہنگ دساتیر میں ہے کہ ''معنی باختر بمشرق کردن خطائے بزرگ است و غلط محض است ۔ '' قاطع برہان میں بھی اس کے معنی صرف مشرق بتائے گئے ہیں ۔ البتہ فرہنگ نفیسی نے اسے لغت الاضداد ہی لکھا ہے ۔

یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ اردو میں کبھی یہ لفظ مغرب کے معنوں میں استعمال ہوا ہے یا نہیں ۔ نوراللغات میں ، شرق و مغرب دونوں معنی درج ہیں ، مگر سند کوئی نہیں دی گئی ہے ۔

حریف : عربی میں ہم پیشہ (حرفہ = پیشہ، صنعت) کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے، لیکن اردو میں اور فارسی میں بھی ، ایک محتمل الضدین لفظ ہے، حسب ذیل معنوں میں :

(۱) مدّمقابل ، دشمن، بدخواہ۔ داغ :

سچ ہے کھٹک ھی جاتی ہے صورت حریف کی
بلبل نے مجھ کو دیکھ کر کھایا ہے خار آج

(۲) رفیق و شریک ، دوست :

نہ کہ کسی سے غالب نہیں زمانے میں
حریف راز محبت ، مگر در و دیوار

خاور : مشرق اور مغرب دونوں معنوں میں مستعمل ہے ۔ اول الذکر کی سند باختر کی ذیل میں دی جاچکی ہے ۔ خاور بمعنی مغرب کی سندیں حسب ذیل ہیں :

(۱) فردوسی :

چو مہر آورد سوئے خاور گریغ
هم از باختر بر زند باز تیغ

(۲) حکیم عنصری :

چو روزی کہ بودش بخاور گریغ
هم از باختر برزند باز تیغ

علامہ اقبال نے بھی حسب ذیل شعر میں خاور بمعنی مغرب استعمال کیا ہے :

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افق خاور سے
بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کردیں

سوا : عربی میں صرف بجز یا الّا (except, save) کے معنوں میں مستعمل ہے ، مگر اردو میں استثنا اور شمول و شرکت دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے :

٭ خاور سے مغربی ممالک مراد ہیں ۔

(۱) اشتمال کے مفہوم میں — داغ :

نہ سنے داور محشر تو کیا کروں اے داغ
سب نے اظہار ہوئے میرے گواہوں کے سوا

(۲) شمول و شرکت یا مزید برآں (in addition to) کے معنوں میں :

"جان عالم نے لاکھ روپے خلعت کے سوا عنایت کیے -" (افسانۂ عجایب)

علاوہ : عربی میں علاوہ صرف مزید برآں (in addition to) کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے ، لیکن اردو میں ان معنوں میں بھی اور الّا یا بجز کے معنوں میں بھی مستعمل ہے اور یہ دونوں صورتیں ایک دوسرے کے متضاد ہیں- جب ہم یہ کہتے ہیں کہ زید اور بکر کے علاوہ عمرو بھی حاضر تھا ، تو ہم اسے اول الذکر معنوں میں استعمال کرتے ہیں - مرزا غالب نے اسے اپنے ایک خط میں آخر الذکر معنی میں یوں استعمال کیا ہے :
"ان دو غزلوں کے علاوہ حال میں کوئی غزل نہیں کہی -" (نادرات غالب)

سر دھنَنا (ہندی محاورہ) انتہائی رنج وملال ظاہر کرنے کےلئے بھی مستعمل ہے اور کمال درجے کے لطف و سرور کے لئے بھی- بمعنی اول الذکر - امیر :

نہ روند اے ابلق ایام مجھ کو میں وہ بیکس ہوں
کہ ساتوں چرخ سر دھنتے ہیں میری پائمالی پر

بمعنی لطف و سرور- میر تقی میر :

باتیں ہماری یاد رہیں' پھر باتیں ایسی نہ سنیے گا
پڑھتے کسی کو سنیے گا' تو دیر تلک سر دھنیے گا

سنّاٹا : (ہندی) بے پناہ شورو غل' جس میں کان پڑی آواز سنائی نہ دے- انشاء اللہ خاں :

کل نو سناٹے سے برسا ھی کیا ساری رات
آنکھ کم بخت نہیں کوئی گھڑی مینہ کی لگی

اس کے برعکس ہو کا عالم ہو ، ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی ہو، تو اس کیفیت کو بھی "سناٹا" ہی کہتے ہیں- جلال لکھنوی :

کیا ہوا کیوں کوئی نالاں کسی کوچے میں نہیں
اب نو سناٹا ھی دن رات وھاں رھتا ھے!

کل : ہندی کا یہ لفظ دو معنوں میں لغۃ الاضداد ھے — دیروز ، جس کی ضد فردا ھے اور ماضی جس کی ضد مستقبل ھے -

(۱) دیروز (گزرا ہوا دن) کے معنوں میں- غالب :

کل تم جو بزم غیر میں آنکھیں چرا گئے
کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

فردا (آنے والا دن) کے معنوں میں-جلیل :

آج ہم سے کل ملیں اغیار سے
کہیے ایسوں سے محبت کیا کریں ؟

(۲) ماضی کے معنوں میں - غالب :

ھیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

مستقبل کے معنوں میں- داغ :

یہیں ہوجائے طے آپس میں جھگڑا کل خدا جانے
تمہارے واسطے کیا ہو، ہمارے واسطے کیا ہو؟

کل ہی کی طرح ''پرسوں'' اور ''اترسوں'' بھی محتمل الضدین ہیں -

لاگ : (ہندی) (۱) عشق و محبت' آنس یا لگاؤ کے معنوں میں - راسخ :

برق کو میرے نشیمن سے لگاؤ
خانہ بربادی کو میرے گھر سے لاگ

میر کا یہ شعر بھی انھی معنوں میں ہے :

جس کے دل کو تیری زلفوں سے میاں لاگ لگے
اس کی آنکھوں میں جو رسّی بھی ہو تو ناگ لگے

(۲) دشمنی ، عداوت ، بیر کے معنوں میں - ناسخ :

دوست سے ان دنوں لگا ہے جو دل
کسی دشمن سے مجھ کو لاگ نہیں

داغ :

کچھ لاگ ، کچھ لگاؤ محبت میں چاہئے
دونوں طرح کا رنگ طبیعت میں چاہئے

مولا : عربی میں اس کے معنی دوست کے بھی ہیں اور آزاد کئے ہوئے غلام کے بھی - فارسی میں آقا اور غلام دونوں معنوں میں مستعمل ہے اور اردو میں زیادہ تر آقا اور مالک کے معنوں میں - میر انشاء :

اے حضرت عشق اے سائیں ، اجی مولا ! مرشد ، مرے مالک ، مرے ہادی ، مرے داتا !

غلام کے معنوں میں - کسی استاد کا شعر ہے :

بدیں ہر دو خصلت غلام تو ام
چہ نامے کہ مولائے نام تو ام

یہاں غلام اور مولا دونوں غلام کے معنوں میں استعمال ہوئے ہیں- شعر کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری ان دونوں خوبیوں کی وجہ سے میں تمہارا غلام ہوں - تمہارا نام بھی کیا نام ہے کہ میں اس کا غلام ہوں -

ننگ : (فارسی) عزت، آبرو، ناموس کے معنوں میں- انشاء :

کہاں صبر و تحمل آہ ننگ و نام کیا شے ہے
میاں رو پیٹ کر ان سب کو ہم یک بار بیٹھے ہیں

عیب رسوائی ، عار اور بدنامی کے معنوں میں غالب :

آبرو کیا خاک اس گل کی جو گلشن میں نہیں
ہے گریباں ننگ پیراہن جو دامن میں نہیں

میر تقی میر :

لایا مرے مزار پہ اس کو یہ جذب عشق
جس بے وفا کو نام سے بھی مرے ننگ تھا

(*) جان شیکسپیر کی ہندوستانی اینڈ انگلش ڈکشنری میں اس لفظ کے معنی یوں بیان کئے گئے ہیں :
(1) honour, reputation, esteem (2) (on the contrary) disgrace, infamy.

"گل کرسٹ اور اس کا عہد"

(ایک اہم گم شدہ کڑی)

محمد عتیق صدیقی

تحقیق کا کام کرنے والا ہر بیان کو پہلے شبہ کی نظر سے دیکھتا ہے، اور ہر بات کے لئے ثبوت چاہتا ہے۔ تشکیک کا یہ پیہم عمل تحقیق سے شغف رکھنے والے میں ایک "پانچویں شعور" کو جنم دیتا ہے، جو کسی جھول دار یا اُلجھا دینے والی بات سے مطمئن نہیں ہونے دیتا۔ "گل کرسٹ اور اس کا عہد" مکمل اور مرتب کر لینے کے بعد مرتب نے جب مسودے کی نظر ثانی شروع کی تو بیشتر مقام ایسے رہ گئے جہاں انتہائی کوشش کے باوجود کسی طرح اُلجھن دُور نہ ہو سکی۔

پہلی اُلجھن تو قرآن کے اُردو ترجمے کے باب میں پیدا ہوئی۔ چند روز کی تلاش و جستجو کے بعد معلومات میں اہم اضافہ ہوا، جو مختصراً یہ تھا:

۱۔ ۱۸۰۴ء کے اوائل میں اس ترجمے کے ۵۶ صفحات چھپ چکے تھے اور کسی نامعلوم وجہ سے مزید طباعت رک گئی۔

۲۔ مارچ ۱۸۰۷ء میں گورنر جنرل کی کونسل نے اس کی اشاعت کو "قابلِ اعتراض" قرار دیا۔

۳۔ مطبع کو ہدایت کی گئی کہ مطبوعہ حصّے کے تمام اجزاء سیکرٹری گورنمنٹ کے حوالے کر دیئے جائیں اور مطبع ایک حلف نامہ بھی داخل کرے کہ اس ترجمے کا کوئی نسخہ نہ تو مطبع نے اپنے پاس رکھا ہے اور نہ کسی کو دیا گیا ہے۔

ان اضافوں نے قرآن کے پہلے مطبوعہ ترجمے کی بیشتر کڑیاں تو فراہم کر دیں، لیکن اس کے ساتھ ہی کچھ نئے سوالات بھی سامنے آ گئے۔ مثلاً یہ کہ:

۱۔ گورنر جنرل کی کونسل نے اس ترجمے کو "قابلِ اعتراض" کیوں قرار دیا۔ یا

۲۔ اس ترجمے میں ایسی کون سی بات تھی جس کے پیش نظر اس کا پورا اہتمام کیا گیا کہ مطبع کے پاس، یا کسی فرد کے پاس اس کا کوئی نسخہ نہ رہنے پائے۔

لیکن باوجود انتہائی کوشش کے یہ گتھیاں سُلجھ نہ سکیں۔ اس کے بعد ایک اور مسئلہ سامنے آ گیا۔

فورٹ ولیم کالج کی دستاویزوں کے مطابق ۲۴ فروری ۱۸۰۴ء کو "شدید علالت" کی وجہ سے گل کرسٹ کو کالج کی ملازمت سے مستعفی ہونا پڑا۔ کالج کونسل کی کارروائیوں کے رجسٹر میں اس کے استعفے کی نقل موجود ہے۔ ان ہی اوراق میں کالج کونسل کی وہ تجویز بھی ملتی ہے جس میں گل کرسٹ کی خدمات کا اعتراف کرنے کے بعد اس کا استعفا منظور کیا گیا تھا۔ انگریزی کے تمام

تذکروں میں بھی گل کرسٹ کے استعفے اور مراجعتِ وطن کا سبب اس کی علالت ہی بیان کیا گیا ہے۔ بہ ظاہر اس بیان کے غلط ہونے کی بھی کوئی وجہ نہیں تھی لیکن میرا "پانچواں شعور" کسی طرح بھی یہ باور کرنے پر آمادہ نہ ہوتا تھا کہ گل کرسٹ نے علالت ہی کی وجہ سے کالج سے علیحدگی اختیار کی تھی۔

نیشنل آرکائیوز (نئی دہلی) میں میرے کیبن (CABIN) میں ایک خاتون بھی بیٹھی تھیں، جو کھڑی بولی پر کام کر رہی تھیں۔ ہم لوگ حسبِ ضرورت ایک دوسرے کی مدد بھی کرتے تھے۔ ان کے کام کی کوئی بات مجھے نظر آتی تو میں ان کو بتلا دیتا، ان کو میرے کام کی کوئی چیز ملتی تو وہ میری طرف بڑھا دیتیں۔ ان کو میری اس الجھن کا بھی علم تھا۔ ان کا قطعی خیال تھا کہ گل کرسٹ کے بیان کو مشتبہ سمجھنا ہٹ دھرمی ہے۔ آٹھ دس دن تک میں نے کالج کونسل کے رجسٹروں اور متعلقہ کاغذات کی بڑی احتیاط کے ساتھ ورق گردانی کی مگر بات جہاں تھی وہیں رہی، میری ہم تحقیق خاتون نے ایک دن جھنجھلا کر کہا: "میں آپ سے عاجز آگئی ہوں۔ اب میں کسی دوسرے کیبن میں بیٹھا کروں گی۔"

میز کا بڑا حصہ میں نے گھیر رکھا تھا اور ان کی کتابیں اور کچھ کاغذات نیچے فرش پر پڑے تھے۔ میں سمجھا کہ یہ اس کی شکایت کر رہی ہیں۔ اپنے کاغذات سمیٹتے ہوئے میں نے معذرت کی تو انہوں نے جواب دیا:

"آپ غلط سمجھے۔ اصل بات یہ ہے کہ آپ کی اس بے سود کوشش سے میرا دم گھٹنے لگا ہے۔ آپ کے شبہ کو صحیح بھی تسلیم کر لوں تو کہوں گی کہ کچھ کام دوسروں کے لئے بھی چھوڑ دیجیے۔ کیا ضروری ہے کہ سارا کام آپ ہی ختم کریں؟"

میں بھی تھک چکا تھا۔ اس لئے ان کے مشورے کی آڑ لیتے ہوئے میں نے کہا:

"اچھی بات ہے آپ ہی کی بات سہی، میں ہار مانے لیتا ہوں۔" لیکن میں نے اپنے شبہ کا اظہار کر دینا ضروری سمجھا۔ چنانچہ مسودے میں جس جگہ یہ جملہ لکھا تھا کہ "۲۴ فروری ۱۸۰۴ء کو گل کرسٹ نے سیکرٹری کالج کونسل کو مطلع کیا کہ شدید علالت کی وجہ سے فوری طور پر اس نے یورپ جانے کا فیصلہ کیا ہے" اتنا اور اضافہ کر دیا کہ "لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گل کرسٹ نے علالت کی وجہ سے استعفا نہیں دیا تھا۔" (گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۸۵)

میری ہم تحقیق خاتون نے نہ جانے کس گھڑی یہ بات زبان سے نکالی تھی کہ "کچھ کام اوروں کے لئے بھی چھوڑ دیجیے" کہ ان ہی کی بات پوری ہو کے رہی۔ کتاب کی اشاعت کے ڈیڑھ دو سال بعد یہ گم شدہ کڑی مجھے نہیں بلکہ ایک خاتون ہی کو اتفاقاً مل گئی، جو مفید ہونے کے ساتھ ساتھ بعض اعتبار سے بے حد اہم بھی ہے۔ اس سے پوری صورتِ حال واضح ہو جاتی ہے اور یہی کڑی قرآن کے ترجمے کی داستان کے خلاؤں کو بھی پُر کر دیتی ہے۔ یہ کڑی کیونکر ہاتھ لگی؟ یہ قصہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔

علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں ایک خاتون ریسرچ اسکالر ہیں ـــــ نیر اقبال، جو ہندستانی زبان کے اُن قواعد نویسوں پر تحقیقی کام کر رہی ہیں، جو ہندوستانی نہیں تھے اور جنھوں نے اٹھارویں اور انیسویں صدی میں ہندستانی زبان کے قواعد پر کتابیں لکھی ہیں۔ یہ خاتون روسی زبان سے پوری واقفیت رکھتی ہیں اور فرانسیسی بھی تھوڑی سی جانتی ہیں۔ تحقیق سے ان کے ذہن کو خاص مناسبت ہے۔ ہندوستانی زبان کے روسی قواعد نگار لے بے دُف پر ان کا ایک طویل مقالہ اُردو ادب (۱۹۶۲ء شمارہ ۴) میں اور ایک دوسرا قابلِ ذکر مقالہ "سر ولیم جونس" اردو ادب (۱۹۶۳ء شمارہ ۱) میں شائع ہوا ہے۔ ان دونوں مقالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایمانداری

اور محنت سے اپنے موضوع کے ساتھ انصاف کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔

اواخر فروری ۱۹۶۳ء میں نیّر صاحبہ اپنے مقالے کے مواد کی تلاش میں دہلی گئیں، جہاں ان کو اور کتب خانوں کے علاوہ نیشنل آرکائیوز میں بھی کام کرنا تھا۔ ان کے دورانِ قیام میں ایک دن میں بھی دہلی گیا تو نیشنل آرکائیوز ہی میں ان سے ملاقات ہوئی اور یہ معلوم کرکے مجھے خوشی ہوئی کہ میری اور خود اُن کی توقعات سے کہیں زیادہ مواد اُن کو وہاں ملا۔ ان کے کام کی خیریت پوچھنے کے بعد میں اپنا کام شروع کرنے ہی والا تھا کہ انھوں نے کہا:

"صدیقی صاحب! ایک بات اور بتلاؤں۔"

"کہیے کوئی نئی بات ہاتھ آئی ہے؟"

"جی ہاں" انھوں نے فخریہ لہجے میں کہا: "بالکل نئی بات!"

"بتلائیے"

"جو بات آپ نہیں ڈھونڈھ سکے وہ مجھے مل گئی!"

"وہ کیا؟"

"فورٹ ولیم کالج سے گل کرسٹ کے استعفے کا اصلی سبب!"

"ایں" بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ کسی اور نے یہ بات کہی ہوتی تو شاید میں جرح شروع کر دیتا۔ لیکن مخاطب نے یہ بات اتنے اعتماد کے ساتھ کہی تھی کہ میں ان سے جرح نہ کر سکا۔

"کہاں ملی؟" میں نے حیرت سے سوال کیا اور اب میں محسوس کرتا ہوں کہ اس سوال میں بے بسی پنہاں تھی اور شکست کا اعتراف بھی۔

"برٹش کونسل کی لائبریری میں ہندستان میں عیسائیت کی تبلیغ سے متعلق ایک پُرانا پمفلٹ مجھے ملا" نیّر اقبال نے پُرسکون لہجے میں اپنی "فتوحات" کی داستان شروع کی: "عیسائی مبلغین نے بھی ہندوستانی پر کام کیا ہے اسی خیال سے اس پمفلٹ کو میں نے پڑھ ڈالا۔ اس میں گل کرسٹ کے استعفے کا قصہ بھی لکھا تھا۔ میں اس کو دیکھ کر اچھل پڑی اور آپ مجھے فوراً یاد آئے۔ اس حصّے کو میں نے اسی وقت نقل کر لیا"______

"لیکن گل کرسٹ کے استعفے اور مشنریوں کے کام میں کیا ربط ہے؟" میں نے کچھ چڑ کر ان سے پوچھا۔

"جی ہاں دونوں میں بڑا قریبی تعلق ہے۔ اس پمفلٹ میں یہ قصہ مارش مین (MARSHMAN) کے حوالے سے لکھا گیا ہے"

"مارش مین کی 'LIFE AND TIMES OF CAREY, MARSHMAN AND WARD' کے حوالے سے؟"

"جی ہاں، اسی کتاب کے حوالے سے"

اس کتاب کی دونوں جلدیں "ہندستانی اخبار نویسی" کی تالیف کے وقت میں نے دیکھی تھیں۔ اس وقت گل کرسٹ میرے ذہن میں کہیں دُور دُور بھی نہ تھا۔ اس لئے کتاب کے صرف ان ہی حصّوں کو میں نے غور سے پڑھا تھا جہاں سے رام پور مشن کے اخبارات کا حال مل سکتا تھا۔ مجھے افسوس کے ساتھ اعتراف ہے کہ میں نے پوری دونوں جلدیں نہیں پڑھی تھیں۔ اگر پوری کتاب

پڑھتا تو گل کرسٹ کے استعفے کا قصہ یقیناً میرے حافظے میں محفوظ رہتا۔

"یہ کتاب تو یہاں موجود ہے" میں نے کہا۔ "میں ابھی لاتا ہوں"

"آپ زحمت نہ کیجئے۔ میں نے اس کتاب کے اقتباسات بھی نقل کر لئے ہیں۔ مارش مین نے اپنی شہادت میں فورٹ ولیم کالج کے وائس پرووسٹ ریونڈ بکھانن (BUCHANAN) کے ایک خط کا حوالہ دیا ہے جو اس کے MEMOIRS میں موجود ہے"

"اس کتاب کی دونوں جلدیں تو میں نے گل کرسٹ ہی کے سلسلے میں پڑھی تھیں"

"بکھانن نے اس خط میں نہ تو گل کرسٹ کا نام ہی لیا ہے اور نہ پورا قصہ ہی بیان کیا ہے بلکہ اس قصے کے صرف بنیادی پہلو کا اس نے ذکر کیا ہے۔ جب تک کسی کو پورا قصہ نہ معلوم ہو۔ وہ اس کی تہہ تک پہنچ ہی نہیں سکتا۔ بکھانن کا خط بھی میں نے نقل کر لیا ہے"

"تو گویا آپ نے پوری مسل مرتب کر لی"

"مسل مرتب نہ کرتی تو مقدمہ جیتتی کیسے؟"

"یہ مسل ہے کہاں؟"

اس سوال کے جواب میں انھوں نے اپنا فائل اٹھایا اور فل سکیپ سائز کے تین چار ورق نکال کر میرے سامنے رکھ دیئے۔ بغیر کچھ کہے ہوئے میں نے ان کو پڑھنا شروع کیا۔

"مقدمہ آپ نے یقیناً جیت لیا ہے"۔ ختم کرنے کے بعد میں نے کہا" اور یہ دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ آپ نے بڑے سلیقے سے یہ مسل مرتب کی ہے"

مجھے سب سے زیادہ مسرت اس بات سے ہوئی کہ نیر اقبال صاحبہ نے انتہائی وسیع القلبی سے کام لے کر یہ سارے کاغذات بڑی خندہ پیشانی سے میرے حوالے کر دیے۔ اس داستان سرائی کے اہتمام سے میرا مقصود ان کی اس علمی فیاضی کا احسان مندی کے ساتھ اعتراف کرنا تھا۔

گل کرسٹ نے ۲۴۔ فروری ۱۸۰۴ء کو سکرٹری کالج کونسل کو مطلع کیا کہ:

"ناگہانی اور شدید علالت سے مجبور ہو کر پہلے جہاز سے یورپ واپس جانے کے لئے ہز ایکسلینسی گورنر جنرل سے اجازت حاصل کرنے کی مجھے ضرورت پیش آئی ہے، جو میں نے حاصل کر لی ہے۔ کلکتہ نامی جہاز کی روانگی کی تاریخ سے جس کا ٹکٹ بھی میں نے خرید لیا ہے، میرا استعفا قبول کیا جائے"

گل کرسٹ کا یہ آخری خط ہے جو کالج کونسل کی کارروائیوں میں ہم کو ملتا ہے۔ اس خط میں اس نے اپنی علالت کا جو عذر پیش کیا تھا وہ کوئی اَن ہونی بات نہ تھی لیکن میرا" پانچواں شعور" گل کرسٹ کی "ناگہانی اور شدید علالت" کو حیلۂ شرعی سمجھنے پر مصر تھا۔ شبہ کی پہلی وجہ تو یہ تھی کہ گل کرسٹ کا استعفا قبول کرتے ہوتے کالج کونسل نے جو تجویز پاس کی تھی وہ مختصر اور بے حد رسمی تھی، جس میں اس کی ادبی خدمات کا اعتراف تو ضرور موجود تھا لیکن نہ تو اس کی اس "ناگہانی اور شدید علالت" کی طرف کوئی اشارہ کیا گیا

تھا“ اور نہ اس کے ساتھ کسی قسم کی ہمدردی ہی ظاہر کی گئی تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ گل کرسٹ کی روانگی کے فوراً ہی بعد کالج کا سالانہ جلسہ ہوا۔ اس موقع پر گل کرسٹ کے سب سے بڑے مربی و محسن گورنر جنرل مارکوئس آف ویلزلی نے کالج کے اور شعبوں کے ساتھ ہندستانی شعبے کا بھی تفصیلی ذکر کیا، لیکن اس واقعہ کا اشارتاً بھی ذکر نہیں کیا۔ یہ دونوں باتیں مجھے بے طرح کھٹک رہی تھیں۔ گل کرسٹ کے استعفے کی ایک وجہ میری سمجھ میں آتی تھی جو میں نے کتاب میں لکھ دی تھی اور وہ یہ تھی:

”ہندستانی زبان کی ترویج و اشاعت اور جدید ہندستانی ادب کو فروغ دینے کے سلسلے میں کالج کونسل نے گل کرسٹ کی توقعات کے مطابق اس کی ہمت افزائی نہیں کی تھی۔ کالج کونسل کی کارروائیاں اس کی غمازی کرتی ہیں کہ گل کرسٹ کو اس باب میں کالج کونسل اور حکومت دونوں سے شکایت بھی تھی۔“ ساتھ ہی میں نے اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری سمجھا تھا کہ ”گل کرسٹ نے اپنے اس آخری خط میں اس طرف (بھی) کوئی اشارہ نہیں کیا تھا۔“

ہر سال کے اوائل میں کالج کے سالانہ جلسے کا انتظام و اہتمام بڑے پیمانے پر کیا جاتا تھا۔ ....

.... کالج کے اساتذہ و طلبہ کے علاوہ عمائدینِ شہر (جن میں ہندوستانی و یورپین دونوں شامل ہوتے تھے) سپریم کورٹ کے جج، بڑے سرکاری ملازمین اور خود گورنر جنرل جلسے میں شریک ہوتے تھے۔ اس موقعے پر ہر زبان کے شعبے کا الگ الگ تقریری مقابلہ ہوتا تھا۔ تقریریں شعبے کی متعلقہ زبان میں کی جاتی تھیں۔ ہر شعبے کا پروفیسر اپنے شعبے کے تقریری مقابلے کے لئے موضوع کا انتخاب کرتا تھا جو پروووسٹ (پرنسپل) کی معرفت گورنر جنرل کی خدمت میں پیش کیا جاتا تھا جسے اس موضوع کو منظور یا مسترد کرنے کا اختیار ہوتا تھا لیکن یہ ایسا اختیار تھا جس کو استعمال کرنے کی نوبت آتی نہیں تھی۔

۱۸۰۴ء کے اوائل میں گل کرسٹ نے ہندستانی شعبے کے پروفیسر کی حیثیت سے اپنے شعبے کے طالب علموں کے تقریری مقابلے کے لیے جس موضوع کا انتخاب کیا تھا اس کا ہندستانی زبانوں میں انجیل کے ترجمے سے براہِ راست تعلق تھا، اور طالب علموں کو اس خیال کی مخالفت یا موافقت کرنی تھی کہ ہندوستانی زبانوں میں انجیل کا اگر ترجمہ ہو جائے اور ہندوستانیوں کو اپنی مذہبی کتابوں سے عیسوی عقائد کا مقابلہ کرنے کا موقع ملے تو عیسائیت کی برتری کو تسلیم کر کے وہ فوراً عیسائیت کو اختیار کر لیں گے۔ گل کرسٹ کی ”اس تجویز نے“ مارش مین کے الفاظ میں ”کلکتے کے یورپین اور مسلمان باشندوں کو شدید ہیجانی کیفیت میں مبتلا کر دیا۔“ اس موضوع کا علم سب سے پہلے ان ہندستانی منشیوں کو ہوا جو کالج میں ملازم تھے۔ ان ہی لوگوں کی وساطت سے یہ قصہ کلکتے کی مسلمان آبادی تک پہنچا۔

اٹھارہویں صدی کے اواخر اور انیسویں کے اوائل میں کلکتے میں انگریزوں کا ایک ایسا گروہ بھی تھا جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارتی اجارہ داری کی وجہ سے اس کا دشمن ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس گروہ نے بھی جو کمپنی بہادر اور اس حکومت کی مخالفت کے کسی موقعے کو ہاتھ سے نہ جانے دیتا تھا، گل کرسٹ کے مجوزہ موضوع پر یہ حاشیہ چڑھایا کہ جلسے کے بعد مسلمانوں کو پکڑ کر گورنمنٹ ہاؤس لے جایا جائے گا اور زبردستی ان کو عیسائی بنایا جائے گا۔ کلکتے ہی میں ذی اثر انگریزوں کی ایک ایسی ٹولی بھی تھی جس کی طرف مارش مین نے اشارہ نہیں کیا تھا جو گل کرسٹ کی ہندوستانی نوازی کی وجہ سے اس کا شدید مخالف ہو گیا تھا۔ کچھ تعجب نہیں ہے کہ اس گروہ نے بھی گل کرسٹ کو زک دینے کی خاطر اس آگ کو ہوا دی ہو۔ بہرحال اس صورت حال نے کلکتے کے مسلمانوں میں ہلچل سی ڈال دی اور انھوں نے

گورنر جنرل کی خدمت میں ایک عرض داشت پیش کی جس میں حکومت کو یاد دلایا گیا تھا کہ کمپنی بہادر کی حکومت نے ہندستانیوں سے اس بات کا وعدہ کیا ہے کہ ان کے مذہبی معاملات میں کوئی مداخلت نہ کی جائے گی۔

ایک طرف مسلمان تھے دوسری طرف عیسائی مبلغوں اور ان کے ہمدردوں کا گروہ تھا۔ اس کے پیشواؤں میں فورٹ ولیم کالج کے پرووسٹ ریورنڈ براؤن، وائس پرووسٹ ریورنڈ بکھانن اور ولیم کیری بھی رہے ہوں تو کچھ تعجب نہیں۔ موخرالذکر ہی رام پورمشن کے کرتا دھرتا اور فورٹ ولیم کالج میں بنگلہ کے پروفیسر تھے۔ بکھانن کے ایک خط سے صورت حال کی نزاکت کا اندازہ ہوتا ہے، جو اس نے ایک دوست کو لکھا تھا۔ اور باتوں کے علاوہ اس خط میں یہ بھی اس نے بتلایا تھا کہ:

> "عوامی نوعیت کے بیش تر معاملات میں حقیقتاً میں اپنے آپ کو یکہ و تنہا پاتا ہوں۔ خصوصاً اس جنگ میں (جس سے بدتر لڑائی میں نے آج تک نہیں دیکھی) جو انجیل مقدس کے ترجمے کے سلسلے میں مسلمان اور ہندو تعصبات سے لڑی جا رہی ہے۔ اس شور و غوغا نے حکومت کو بھی اپنی زد میں لے لیا ہے۔ لارڈ ولزلی اور بارلو[1] (BARLOW) غیر جانب دار ہیں۔"

لیکن یہ حقیقت ہے کہ کم از کم ولزلی اس قصے میں زیادہ عرصے تک غیر جانب دار نہ رہ سکا اور اسے بھی "شور و غوغا" کرنے والوں کے آگے سپر ڈالنی پڑی۔ یہ فیصلہ کرنے سے پہلے اس نے ایک بار سے زیادہ اس معاملے پر غور کیا ہوگا۔ کیونکہ اس کو اس کا بھی یقین رہا ہوگا کہ عیسائیت کے علم بردار اس قصے کو یہیں ختم نہ کر دیں گے بلکہ انگلستان کی پارلیمنٹ تک لے جائیں گے، اور یہ بات بھی اس کے پیش نظر رہی ہوگی کہ خود برسر اقتدار حکومت میں جو لوگ اس کے خلاف ہیں وہ بھی اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے۔

لیکن ولزلی وِنگ اور ضدی بھی تھا ایسا آدمی خود رائے بھی ہوتا ہے۔ اپنی فطرت کے ان پہلوؤں کا مؤثر مظاہرہ اس نے فورٹ ولیم کالج کے قیام کے سلسلے میں بھی کیا تھا۔ یہ کالج کورٹ آف ڈائرکٹرس کی منظوری کے بغیر اس نے قایم کر دیا تھا اور جب کورٹ آف ڈائرکٹرس نے اس پر اعتراض کیا اور کالج کو توڑنے کے احکام صادر کر دیے تو وہ مستعفی ہونے اور جنگ کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ بالآخر کورٹ آف ڈائرکٹرس کو اپنے احکام واپس لیتے ہی بنی۔ چنانچہ اس موقعے پر بھی حقیقت پسندی سے کام لے کر اور ساری مخالفتوں کو پس پشت ڈال کر گل کرسٹ کے مجوزہ موضوع کو، جس کی وہ خود بھی رسمی منظوری دے چکا تھا مسترد کر دیا۔ "گورنمنٹ کی یہ مداخلت" مارشمین کے الفاظ میں "گل کرسٹ کو اس درجہ ناگوار ہوئی کہ طیش میں آ کر اس نے کالج کی ملازمت سے استعفا دے دیا اور انگلستان واپس چلا گیا۔"

گل کرسٹ یقیناً مغلوب الغضب اور جذباتی انسان تھا۔ اس نے ضرور استعفا دیا ہوگا لیکن ولزلی کا اس پر بے حد اثر تھا، میرا خیال ہے کہ ولزلی اس کو روکنا چاہتا تو وہ یقیناً رک بھی جاتا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس واقعے کے بعد ولزلی نے اس کو روکنا مناسب نہ سمجھا ہوگا۔ گل کرسٹ کی روانگی کے وقت ولزلی نے اس کو جو سفارشی خطوط دئیے تھے وہ اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ گل کرسٹ اور ولزلی کے تعلقات پر یہ واقعہ اثر انداز نہیں ہوا تھا۔

---

[1] بارلو فورٹ ولیم کالج کی کونسل کا ممبر اور کالج میں قانون کا پروفیسر تھا۔

فورٹ ولیم کالج سے گل کرسٹ کے مستعفی ہونے اور مراجعتِ وطن کا سبب' موجودہ معلومات کی روشنی میں یہی تھا جو اُوپر درج کیا گیا ہے۔ قرآن کے ترجمے کو روک دینے کا بھی میرے خیال میں یہی سبب تھا۔ اس طرح سے یہی ایک کڑی "گل کرسٹ اور اس کا عہد" کے دو اہم خلاؤں کو پُر کرتی ہے۔ مجھے خوشی ہے اور ساتھ ہی ساتھ افسوس بھی کہ کسی تنقید نگار نے مؤلف سے اس کا مطالبہ نہیں کیا کہ اس خلا کو پُر کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی گئی۔ تحقیق کا کام ایک عوامی اصطلاح میں "علم دریاؤ" ہے اور "دریاؤ" ہی کی طرح اس کے دھارے پیچھے کی طرف نہیں بلکہ ہمیشہ آگے ہی بڑھتے ہیں۔ یہ ایک ایسا کاروان ہے جس کی کوئی منزل نہیں' جو کسی ایک مقام پر قیام نہیں کرتا اور جو ہر لحظہ رواں دواں رہتا ہے۔ سائنسی تحقیق کی دنیا تو ہر لحظہ نت نئے انقلابات سے زیر و زبر ہوتی رہتی ہے۔ چنانچہ سائنسی ذہن ہر انقلاب کو خوش آمدید کہنے اور کھلے دل سے اس پر غور کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتا ہے۔ سائنس کے برعکس ادب کی قلمرو میں انقلاب بہت کم آتے ہیں۔ ہاں کبھی کبھار بعض نئی باتیں ضرور سامنے آتی ہیں جن سے ہماری معلومات میں یقیناً قابلِ قدر اضافہ ہوتا ہے، لیکن ادبی تاریخ کے مسلمہ نظریوں میں ان سے کوئی بنیادی تبدیلی نہیں ہوتی۔ اسی چیز نے ادبی ذہن کو کچھ حد تک جامد بنا دیا ہے۔ یہ بات مشرقی ادبی ذہن پر زیادہ صادق آتی ہے، جہاں اپنے ہی تراشیدہ اصنام کی پرستش کا جذبہ اکثر و بیشتر لوگوں کو، غیر شعوری طور پر، وراثتاً ملتا ہے، جو تحقیق کی راہ میں سنگِ گراں بن کر حائل ہوتا ہے۔

اُردو نامہ کے تازہ شمارے، (شمارۂ دوازدہم۔ اپریل تا جون ۱۹۶۳ء)، میں "گل کرسٹ اور اس کا عہد" پر تبصرہ نظر آیا اسے پڑھ کر مجھے اس اعتبار سے بے حد خوشی ہوئی کہ اس مضمون کے آخری حصے میں جن خیالات کا میں نے اظہار کیا تھا، اس تبصرے نے ان کی تائید ہی نہیں بلکہ توثیق بھی کر دی۔ بے محل نہ ہوگا، اگر اسی سلسلے میں بعض غلط فہمیوں اور شبہات کا ازالہ کر دیا جائے جن کا اسی تبصرے میں اظہار کیا گیا ہے۔

میرے ذہن میں گل کرسٹ کی جو دھندلی سی تصویر تھی ۔۔ یا جو مجھے وراثتاً ملی تھی۔۔ اس تصویر میں گل کرسٹ کے سر پر فورٹ ولیم کالج کی پرنسپلی کا تاج بھی تھا۔ کام شروع کرنے کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کی دستاویزوں سے، گل کرسٹ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی اس کے مدرسے کی رپورٹوں سے، اور فورٹ ولیم کالج کی قلمی کارروائیوں سے گل کرسٹ کا ایک نیا خاکہ تیار ہوا۔ لیکن اس واضح تصویر میں گل کرسٹ کے سر پر فورٹ ولیم کالج کی پرنسپلی کا نقلی تاج نہ تھا۔

فاضل تبصرہ نگار نے شکایت آمیز لہجے میں لکھا ہے کہ "صفحہ ۳۱ پر اس موضوع پر بحث کی گئی ہے کہ گل کرائسٹ[۱] فورٹ ولیم کالج کا پرنسپل تھا یا نہیں"۔ تبصرہ نگار کو یہ معلوم کر کے اور زیادہ حیرت ہوگی کہ انگریزی کے دو ایسے تذکرے بھی ضرور موجود ہیں، جن میں گل کرسٹ کو فورٹ ولیم کالج کا پرنسپل نہیں بلکہ صرف پروفیسر لکھا گیا ہے۔ ان کے نام یہ ہیں:

---

[۱] فاضل تبصرہ نگار نے ہر جگہ "گلکرائسٹ" ہی لکھا ہے۔ یہاں تک کہ کتاب کا نام بھی جلی قلم سے "گلکرائسٹ اور اس کا عہد" ہی لکھا گیا ہے اگرچہ کتاب کے اندرونی صفحات میں بھی اس کی وضاحت کر دی گئی تھی کہ GILCHRIST کا تلفظ "گل کرسٹ" ہے۔ عیسائی حضرت عیسیٰ کے نام پر نام تو CHRIST رکھ لیتے ہیں، لیکن احتراماً اس کا تلفظ بدل کر کرسٹ کر دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے CHRISTMAS کرسمس ہو گیا، CHRISTY کرسٹی ہو گیا اور CHRISTOPHER کرسٹوفر بن گیا۔ گل کرسٹ کے عہد کی، اور اس کے بعد کی بھی، مطبوعات میں ۔۔ گل کرسٹ ہی لکھا گیا ہے۔

۱۔ W. ANDERSON'S SCOTTISH NATION

۲۔ CHAMBER'S EMINENT SCOTSMEN

ان کے متعلقہ صفحات کی PHOTOSTAT نقلیں، کتاب چھپنے کے بعد، انڈیا آفس لائبریری سے موصول ہوئیں۔ اس لئے "گل کرسٹ اور اس کا عہد" میں ان کے اقتباسات پیش نہیں کئے جا سکے۔ رہا یہ سوال کہ "ان مستند مؤلفین سے ایسی غلطی کیوں ہوئی؟" اس کا جواب فاضل تبصرہ نگار کو دینا ہے۔

فاضل تبصرہ نگار نے اپنے جذباتی نقطۂ نظر کی حمایت کی رَو میں بعض ایسے بیانات بھی مؤلف سے منسوب کر دیے ہیں جن کا حقیقت سے اتنا ربط بھی نہیں جتنا صبح کاذب کا صبح صادق سے ہوتا ہے۔ مثلاً ان کا یہ فرمانا کہ :

"عتیق صاحب کی پیش کردہ تحریرات و اسناد سے واضح ہے کہ گلکرائیسٹ اپنی تجاویز متعلق تالیفات و طباعت وغیرہ کونسل میں پیش کرتا تھا، جس میں پرنسپل کے توسط یا منظوری کا ذکر نہیں۔"

خط کشیدہ الفاظ پر غور کیجیے۔ فاضل تبصرہ نگار کو اس طرح کی عبارت نہ جانے کس کتاب میں ملی۔ "گل کرسٹ اور اس کا عہد" میں تو کسی جگہ یہ نہیں لکھا گیا کہ فلاں تجویز گل کرسٹ نے "کونسل میں پیش" کی۔ اس کے برعکس جگہ جگہ اس طرح لکھا گیا ہے: "کالج کونسل کی کارروائیوں میں گل کرسٹ کا جو پہلا خط ملتا ہے" (ص ۱۴۳)، یا "سیکرٹری کالج کونسل نے اس کو لکھا" (ص ۱۵۱)، یا اس خط میں گل کرسٹ نے سیکرٹری کالج کونسل کو لکھا" (ص ۱۵۶)۔

فاضل تبصرہ نگار کا ایک اہم اعتراض یہ بھی ہے کہ "صفحہ ۲۰۳ تا ۲۳۴ پر مصنفین کے خود نوشت حالات اور وجہ تصنیف ان کتابوں سے نقل کئے گئے ہیں جو قبل ازیں تاریخ ادب اُردو میں آ چکے ہیں مثلاً نوطرز مرصع اور رانی کیتکی وغیرہ"۔ اس کے ساتھ ہی طنزیہ لہجے میں مشورہ بھی دیتے ہیں کہ "بہتر تھا کہ فاضل مصنف اُن کتابوں کے نمونے اور کچھ حالات مصنفین پیش کرنے کی سعی بھی فرماتے جو منظر عام پر نہیں آئے ہیں"۔ مصنفین کے خود نوشت حالات دو جگہ درج کئے گئے ہیں۔ صفحہ ۲۰۳ تا ۲۳۴، اور صفحہ ۲۹۸ تا ۳۱۲، ان دونوں جگہوں پر نوطرز مرصع اور رانی کیتکی کا نام بھی نہ ملے گا، جس کی وجہ یہ ہے کہ خود نوشت حالات صرف ان ہی مصنفین کے پیش کئے گئے ہیں جو گل کرسٹ کے عہد میں فورٹ ولیم کالج سے براہ راست یا بالواسطہ متعلق تھے۔ اس فہرست میں نوطرز مرصع اور رانی کیتکی دونوں کے مصنف شامل نہیں کئے جا سکتے۔ ان دونوں کتابوں کے اقتباسات "جدید ہندستانی ادب کے چند ابتدائی نمونے" کے باب میں ضرور پیش کئے گئے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ فورٹ ولیم کالج سے جو مصنفین وابستہ تھے، ان میں سے بیشتر کے حالات عموماً، اور خود نوشت حالات خصوصاً کسی کتاب میں یکجا نہیں ملتے، اس لئے ان کو ایک جگہ مرتب کر دینا، قابل اعتراض نہ ہونا چاہیے۔

رہا فاضل تبصرہ نگار کا یہ ارشاد کہ "بہتر تھا کہ فاضل مصنف ان کتابوں کے نمونے اور کچھ حالات مصنفین پیش فرمانے کی سعی بھی فرماتے، جو منظر عام پر نہیں آئے ہیں"؛ اس کا ایک سیدھا سا جواب تو یہ ہے کہ ان سے مؤدبانہ درخواست کی جائے کہ وہ ایک بار ٹھنڈے دل سے پوری کتاب کا مطالعہ کرنے کی "سعی بھی" فرمائیں، تو کچھ ایسی "کتابوں کے نمونے اور کچھ حالات مصنفین" ضرور ملیں گے "جو منظر عام پر نہیں آئے ہیں" اور کچھ ایسے مصنفین کے نام بھی ملیں گے، جن کے ذکر سے ہماری ادبی تاریخیں خالی ہیں۔ "گل کرسٹ اور اس کا عہد" کے آخری صفحات (۲۹۸-۳۱۲) پر مندرجۂ ذیل مصنفین کے خود نوشت حالات، ان کی غیر مطبوعہ

کتابوں سے پیش کئے گئے ہیں :

۱۔ باسط خاں باسطؔ	مقتبس از	قصۂ گُل صنوبر	۵۔ مظہر علی خاں ولاؔ	〃	〃	جہاں گیر شاہی
۲۔ خلیل علی خاں اشکؔ	〃 〃	انتخاب سلطانیہ	۶۔ منصور علی	〃	〃	بحرِ عشق
۳۔ مرزا مغل	〃 〃	باغِ سخن	۷۔	〃	〃	احوال ترجمہ
۴۔ معین الدین فیضؔ	〃 〃	چشمۂ فیض				قرآن شریف

ان اقتباسات میں جو "حالاتِ مصنفین" ملتے ہیں، ان کا بھی یہی حال ہے، اور وہ "قبل ازیں تاریخ ادب اُردو میں" نہیں آئے ہیں۔ اس وقت میرے سامنے مولوی سید محمد کی "اربابِ نثرِ اُردو" ہے جو اس اعتبار سے قابلِ قدر ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے مصنفین اور ان کی تالیفات پر یہ پہلی کتاب ہے۔ اس کتاب میں بھی مندرجہ بالا کتابوں کے اقتباسات نہ ملیں گے۔ جہاں تک مصنفین کا تعلق ہے، مظہر علی خاں ولاؔ کے علاوہ خلیل علی اشکؔ اور معین الدین فیضؔ کے صرف نام ہی مل سکیں گے۔ اشکؔ کے متعلق "صاحبِ اربابِ نثرِ اُردو" کا بیان ہے کہ "ہم نے اردو شاعروں کے تقریباً تمام تذکروں کی ورق گردانی کی مگر ان کا حال کسی میں نہیں ملا...... افسوس! اشکؔ نے اپنے آبا و اجداد اور مولد و وطن کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں لکھا...... مقام پیدائش و تعلیم و تربیت تک کا حال نہیں معلوم" (ص ۲۱۶-۲۱۷)۔ لائق تبصرہ نگار کو "گل کرسٹ اور اس کا عہد" کے صفحہ ۳۰۱ تا ۳۰۳ پر خلیل علی خاں اشکؔ کے خود نوشت حالات ملیں گے۔ اسی طرح فیضؔ کے متعلق انہوں نے لکھا ہے کہ "فیضؔ کا حال کسی تبصرے میں نہیں ملتا...... ڈاکٹر اشپرنگر نے ان کی ایک تالیف دیکھی ہے" (۲۷۴)۔ فیضؔ کے مختصر خود نوشت حالات صفحہ ۲۷۴ پر مل سکتے ہیں۔ "گل کرسٹ اور اس کا عہد" لائق تبصرہ نگار کو "بعض لحاظ سے ابھی تشنہ معلوم ہوتی ہے" کیوں کہ "گل کرسٹ اور اس کا عہد" کے مؤلف نے سر ولیم جونز کے زمانے اور ان کے سالِ وفات کا تعین نہیں کیا ہے"۔ گویا یہ کتاب گل کرسٹ پر نہیں بلکہ سر ولیم جونز پر لکھی گئی ہے یا کم از کم اس کتاب کا کوئی باب ہی ان کے لئے وقف کیا گیا ہے۔

فاضل تبصرہ نگار نے گل کرسٹ پر بھی دو اعتراض کئے ہیں۔ پہلا اعتراض یہ ہے :

"مؤلف نے صفحہ ۲۴۱ تا ۲۶۱، بیس صفحے میاں مسکینؔ کے مرثیے کیلئے وقف کر دیے ہیں۔ گلکرائسٹ کی یہ ہدایت کہ مسکینؔ کے مراثی کا مطالعہ مبتدیوں کے لئے بے حد مفید ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آئی؟"

فاضل تبصرہ نگار سے زیادہ اور کسی کو اس کا علم نہ ہوگا کہ عبداللہ مسکینؔ کے مراثی اب تک منظرِ عام پر نہیں آئے ہیں، اور شاید یہ بھی ان کو معلوم ہو کہ مسکینؔ کے مراثی کا بہت بڑا ذخیرہ سید مسعود حسن رضوی صاحب کے پاس ہے اور اس ذخیرے میں میاں مسکینؔ کا یہ مرثیہ نہیں ہے۔

گل کرسٹ کی یہ ہدایت کچھ ایسی بے محل نہ تھی۔ فاضل تبصرہ نگار اس حقیقت کو اگر سامنے رکھیں کہ ۱۷۹۶ء میں جب گل کرسٹ نے مبتدیوں کے لئے میاں مسکینؔ کے مراثی کا مطالعہ مفید قرار دیا تھا، اس وقت نوطرزِ مرصع کے علاوہ اردو نثر کی اور کوئی کتاب نہ تھی، اور یہ مبتدیوں کیلئے عموماً اور غیر ملکی مبتدیوں کے لئے خصوصاً غیر مفید ہی نہیں بلکہ مضر ہوتی۔ دواوین اور کلیات کی ایسی کمی نہ تھی لیکن ان کی زبان عام فہم نہیں بلکہ ثقیل ہے۔ اس لئے مبتدی ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ مسکینؔ کا مرثیہ جو گل کرسٹ کی ہدایت کے مطابق نقل بھی کیا گیا ہے، اس کی زبان نسبتاً بہت آسان ہے، جس سے مبتدی بہت کچھ فائدہ اٹھا سکتے تھے۔

گل کرسٹ پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ :-

"صفحہ ۹۰ پر لکھا ہے کہ گل کرائسٹ نے اپنی تالیف شیکسپیر کے اردو ترجمے کے آخر میں ۳۱ صاحبِ دیوان شعراء کی فہرست درج کی ہے جس میں امیر خسرو اور ملک محمد جائسی کو اُردو کا صاحبِ دیوان شاعر قرار دیا ہے۔ نیز یہ کہ جعفر زٹلی بھی معیاری شاعر تھا، غور طلب ہے۔"

اس اعتراض کا جواب دینے سے پہلے فاضل تبصرہ نگار کے اس سہو کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ زیرِ بحث فہرست گل کرسٹ کی GRAMMER OF THE HINDOSTANEE LANGUAGE میں ہے اور شیکسپیر کے اردو ترجمے کے نام سے یا اس موضوع پر نہ تو گل کرسٹ ہی نے کوئی کتاب لکھی اور نہ مؤلف ہی نے اس طرح کی کسی کتاب کا ذکر کیا ہے۔

اب آپ اصل اعتراض کو لیجئے جو صرف لفظی ہیر پھیر سے وارد ہوا ہے۔ گل کرسٹ نے "امیر خسرو اور جائسی کو اردو کا صاحبِ دیوان نہیں' بلکہ "ہندوستانی کا شاعر" کہا ہے۔ "گل کرسٹ اور اس کا عہد" پڑھنے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ گل کرسٹ کے نقطۂ نظر کے مطابق "ہندوستانی" برابر تھی "ہندی + اُردو" کے۔ اور فاضل تبصرہ نگار خسرو اور جائسی دونوں کو ہندی کے شاعر تسلیم کرنے سے گریز نہ کر سکیں گے۔

جعفر زٹلی کے باب میں فاضل تبصرہ نگار نے جو اعتراض کیا ہے، اس کی نوعیت بھی سابقہ اعتراض سے مختلف نہیں ہے۔ تبصرہ نگار کے بیان کے مطابق "گل کرسٹ کے نزدیک "جعفر زٹلی بھی ایک معیاری شاعر تھا" اور اس کا یہ خیال "غور طلب ہے۔" لیکن اس سے کہیں زیادہ یہ بات "غور طلب ہے" کہ گل کرسٹ نے جو کچھ کہا ہے اور کتاب میں جو کچھ لکھا ہے وہ تو صرف اس قدر ہے :

"جعفر، جعفر زٹلی، دہلی (عہد) عالم گیر۔"

اس اقتباس میں جعفر زٹلی کو "معیاری شاعر" ہونے کا کوئی سرٹیفکیٹ نہیں دیا گیا ہے۔ جعفر زٹلی کے صاحبِ دیوان ہونے سے تو شاید فاضل تبصرہ نگار کو بھی انکار نہ ہوگا اور شاید وہ یہ بھی تسلیم کریں گے کہ جعفر زٹلی کے ابتذال کے باوجود ہماری ابتدائی ادبی تاریخ میں، اس کو کچھ نہ کچھ اہمیت ضرور حاصل ہے۔ ایک دکنی محقق نصیر الدین ہاشمی صاحب علی گڑھ تاریخ ادب اردو میں جعفر زٹلی کی ادبی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ،

"ان کی ظرافت عموماً، اگرچہ فحش گوئی تک پہنچ جاتی ہے، لیکن ان کے کلام کی بے تکلفی سے انکار نہیں کیا جاسکتا...... اس زمانے کی زبان کا جتنا اندازہ ان کے کلام سے ہو سکتا ہے، کسی دوسرے کے کلام میں ملنا مشکل ہے۔" (علی گڑھ تاریخ ادب اردو ص ۵۰۱)

اس تبصرے کے ابتدائی حصے میں فاضل تبصرہ نگار نے اپنا یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ "غالباً کالج کا مکمل ریکارڈ تو انڈیا آفس لائبریری میں ہے۔" انھیں یہ معلوم کر کے خوشی ہوگی کہ فورٹ ولیم کالج کی کارروائیوں کا مکمل ریکارڈ نیشنل آرکائیوز آف انڈیا (نئی دہلی) میں محفوظ ہے، جو رجسٹر سائز کے تقریباً نو دس ہزار صفحات پر پھیلا ہے اور انیس ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ ان صفحات میں فورٹ ولیم کالج ہی کی تاریخ نہیں ہے بلکہ ہماری ابتدائی ادبی تاریخ کے اہم نوادر بھی ان اوراق میں چھپے ہیں۔

زمیں کا بُراق

جوشؔ ملیح آبادی

رواں ہوا ہے سوئے آسماں زمیں کا بُراق
نگاہ رُو بروائے روحِ انفُس و آفاق

بڑھا ہے جانبِ انساں درایتوں کا شعور
مُڑا ہے سوئے بیاباں روایتوں کا مراق

عروسِ دانشِ حاضر اُلٹ رہی ہے نقاب
جھلک رہی ہے انگوٹھی دمک رہا ہے بُلاق

جو چرخِ پیر نے بخشے تھے بچگانِ فسُوں
اُنھیں زمینِ جواں کر چکی ہے یک سر عاق

تمام اثاثۂ ذہنی پہ تھی نظر جس کی
اب اُس عجوزہ کو دے دی ہے آدمی نے طلاق

اُٹھا رہا ہے ادب ، سازِ منطق و حکمت
دُکاں بڑھاؤ اب اے مُطربانِ وصل و فراق

زمین توسنِ گردوں پہ ہو رہی ہے سوار
رکاب تھام کے چل اے ذہانتِ مشتاق

نہ اعتراض کر اس جذبۂ بغاوت پر
کہ ہے سیادتِ گردوں غرورِ خاک پہ شاق

جمودِ خواب و شبِ تار اضطراب ، سلام
کہ اب نظر ہے خبر تشنۂ و سحر مشتاق

یہ آرزو ہے کہ معراج اب ہو لیے قوسین		بنا اب ایک بُراق اور جودتِ خلّاق
غلط کہ بارشِ رحمت ہے کارسازِ معاش		جبینِ اہلِ عمل کا پسینہ ہے رزّاق
اب آدمی کے قدم آفتاب چُومے گا		اب آسمان کا ہوگا زمین سے الحاق
بلندیوں پہ نئے شہر جگمگائیں گے		قمر پہ قصر بنیں گے تو مشتری پہ رواق
بزورِ پُشت کواکب پہ کاٹھیاں رکھ دیں		ازل کے روز سے ذرّوں کا ہے یہ استحقاق
نشیب کو جو حقوقِ فراز بخشے گا		خوشا کہ معرضِ تحریر میں ہے وہ میثاق
شہود و غیب کے دفتر کھلے ہوئے ہیں تمام		حسابِ ارض و سما ہو رہا ہے اب بیباق
نکل رہا ہے جلوسِ مذاقِ فکرِ جدید		کدھر ہے ذُرّیتِ عشق و اُمّتِ اشراق
اُبل رہے ہیں حروفِ کہن سے معنیٔ نو		محلِّ وجد ہے اے ناقدِ سیاق و سباق
ابھی نہیں نہ سہی، کل یہ نعرہ گونجے گا		کہ دہر کا ہے بشر قادرٌ علی الاِطلاق

مسیحِ وقت پئے قطعِ حرفِ مرگ لے جوش
اُلٹ رہا ہے کتابِ حیات کے اوراق

اُردو کی پہلی کتاب

ترقیٔ اردو بورڈ نے مولانا محمد حسین آزاد کی ابتدائی درسی کتابوں کا پورا سلسلہ "اردو کی پہلی کتاب" (حصّہ اول تا چہارم) کے زیر عنوان شائع کیا ہے، جسے ڈاکٹر اسلم فرخی نے بورڈ کی فرمائش پر ترتیب دیا ہے۔ ذیل میں جناب ممتاز حسن کا پیش لفظ شائع کیا جاتا ہے جو کتاب کے ساتھ شامل ہے۔

اردو کی پہلی، دوسری، تیسری اور چوتھی کتاب محمد حسین آزاد کی اہم ترین تصانیف میں سے ہیں۔ اگرچہ میں نے ذاتی طور پر اس بات کی تحقیق نہیں کی لیکن قرین قیاس یہی ہے کہ یہ اردو زبان کی سب سے پہلی درسی کتابیں ہیں جو ابتدائی مدارس کے لئے لکھی گئیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو اردو کی پہلی کتاب کو اردو کی پہلی درسی کتاب کہنا صحیح ہوگا۔

آزاد سا صاحب طرز انشا پرداز نہ ہر زبان کو میسر ہوتاہے، نہ ہر ملک کو۔ یہ اردو زبان کی خوش قسمتی ہے کہ اسے ایسا اہل قلم ملا۔ اس باکمال کے کمال کا کیا کہنا۔ تاریخ ہو کہ افسانہ، فلسفہ ہو کہ ادب، علمی مقالات ہوں کہ نجی مکتوبات، انداز تحریر کا ہر جگہ یہ عالم ہے جیسے یہ انداز خاص طور پر اسی موضوع کے لئے تخلیق ہوا تھا۔ فصاحت اور بلاغت کے تقاضے تاریخ نویسی کے لئے اور ہیں، اور ادبی تذکرہ نگاری کے لئے کچھ اور، لسانی تحقیق کے لئے کچھ اور ہیں، اور بچوں کی درسی کتابوں کے لئے کچھ اور۔ یہ آزاد کی فنّی عظمت کی دلیل ہے کہ اس نے ان مختلف النوع تقاضوں کو اپنے انداز کی انفرادیت برقرار رکھتے ہوئے ہر جگہ کمال خوبی سے پورا کیا ہے۔ اس جادو نگار کے قلم میں وہ جادو ہے، کہ اس کی ایک جنبش سے حقیقت افسانہ بن جاتی ہے، اور افسانہ حقیقت۔ اب آپ لاکھ کہیں کہ یہ واقعہ یوں نہیں یوں ہے۔ دل وہی مانے گا، جو آزاد نے کہا۔ محقق جو چاہے جتن کرے، آزاد کا لکھا مٹ نہیں سکتا۔

اسی اردو کی پہلی کتاب ہی کو لے لیجئے۔ ''ماں بچے کو گود میں لئے بیٹھی ہے، باپ حقہ پی رہا ہے''۔ اگر آپ نے بچپن میں یہ پڑھا ہے، تو کیا آپ اسے بھول سکتے ہیں۔ دنیا بدل گئی، معاشرہ کچھ کا کچھ ہوگیا، مگر آج بھی جب پڑھی لکھی مائیں بچوں کو گود میں لینے کی بجائے انہیں اکثر آیاؤں اور پنگوروں کے سپرد کردیتی ہیں، اور پڑھے لکھے خوشحال باپ حقے سے زیادہ سگریٹ اور پائپ کی طرف مائل نظر آتے ہیں، ہمیں تو یہی بات ٹھیک معلوم ہوتی ہے، کہ ماں بچے کو گود میں لے کر بیٹھے اور باپ حقہ نوشی کرے۔ یہی حال مولوی صاحب کے گھوڑے کا ہے۔ پروفیسر صاحب جتنا چاہیں اپنی کار میں گھومتے پھرتے نظر آئیں، مولوی صاحب اور ان کے گھوڑے کی گرد کو بھی نہیں پہنچ پائیں گے۔

سچ تو یہ ہے کہ جب ہم آزاد کو جادو بیان کہتے ہیں، تو اس میں مبالغہ کا شائبہ بھی نہیں ہوتا، وہ واقعی ایک جادو نگار اور معجز بیان اہل قلم ہے۔ بچوں کے لئے اس نے جو کچھ لکھا، کیا موضوع کے لحاظ سے اور کیا طرز بیان کے اعتبار سے، ایسا تھا کہ جس بچے نے پڑھا، اُس کے ذہن میں تصویر کی طرح نقش ہوگیا۔ فقرے کے فقرے ازبر ہوگئے، اب چاہو بھی تو یاد سے نہیں اُترتے، کیا اردو زبان اور ادب کی بنیاد اس سے زیادہ مستحکم ہو سکتی ہے؟ آزاد کے بعد بے شمار درسی کتابیں بچوں کے لئے لکھی گئیں، اور ٹیکسٹ بک کمیٹیوں نے منظور فرمائیں، مگر کیا ایک بھی کتاب ایسی لکھی گئی ہے، جو آزاد کی تصنیف تک پہنچ سکے۔

آزاد کی پہلی، دوسری، تیسری اور چوتھی کتاب محض اپنے طرز تحریر اور انداز بیان ہی کے سبب قابل قدر نہیں ہیں، ان میں اس سے بھی زیادہ اہم ان کے موضوعات ہیں، اور وہ قدریں ہیں، جن پر ہمارا معاشرہ قائم تھا، اور جنہیں ہم آج ڈھونڈتے ہیں اور نہیں پاتے۔ ماں باپ کی محبت، بچوں کی سعادت مندی، اُستاد کی شفقت، شاگردوں کی عقیدت، میاں بیوی کا رشتہ، دوستوں کی دوستی، خدا پر ایمان، اپنے مذہب اور ثقافت سے وابستگی، یہ سب تصورات، یہ سب اقدار ان کتابوں میں اس طرح سموئے گئے ہیں کہ وعظ و نصیحت کا گمان بھی نہیں ہوتا، اور وہ دل میں اترتے چلے جاتے ہیں۔

یہی نہیں، اُن کتابوں کو غور سے دیکھئے، ان میں مظاہر قدرت، حیوانات اور نباتات کی دنیا کا نقشہ ایسے دلکش انداز میں کھینچا گیا ہے کہ بچوں کے لئے اس میں تفریح کا سامان بھی ہے، اور علمی دلچسپیوں کا ذخیرہ بھی۔ اس کے علاوہ معاشرے کے مختلف پہلوؤں کی تصویریں اس کمال فن سے پیش کی گئی ہیں کہ انہیں ایک بار دیکھ کر دوبارہ دیکھنے کی ہوس باقی رہتی ہے۔ ''کھانا پک رہا ہے۔'' ''پسنہاری آٹا پیس رہی ہے۔'' ''پہلوان

کشتی لڑرہے ہیں۔'' ''مچھلی والے مچھلیاں پکڑتے ہیں۔'' ''دریا میں تیراک تیر رہے ہیں''۔ غرض کون سی تصویر ہے جسے دیکھو اور بھول سکو۔ یہ دل فریب نقاشی بچوں کے دل میں اپنے ماحول سے دلچسپی پیدا کرنے کا وسیلہ، بلکہ یوں کہئے کہ تیر بہدف نسخہ ہے۔ ہماری قومی زندگی، قومی اصلاح، قومی بہبودی، سب کا انحصار اسی دلچسپی پر ہے۔ اگر ہمیں اپنے ماحول سے دلچسپی بلکہ دلبستگی نہیں ہوگی تو ہم اپنے معاشرے کی فلاح اور اصلاح کو اہمیت نہیں دیں گے، اور جیسا کہ ہم آج کل دیکھ رہے ہیں، ہم میں سے اکثر لوگ یورپ اور امریکہ کی طرف عمر بھر ٹکٹکی لگا کر دیکھتے رہیں گے، اور اپنے گھر کی خبر تک نہ ہوگی۔

پھر ان کتابوں میں یہ بھی دیکھئے کہ بچوں کے لئے اچھی اور صحت مندانہ ورزشوں اور کھیلوں کی ترغیب جابجا موجود ہے۔ ''آؤ دریا کی سیر کریں۔ اوھو! کیا چڑھا ہوا ہے۔ تیراکوں کی بن آئی ہے، کسی نے مشک پھلائی ہے، چھاتی تلے دبائی ہے۔ بہاؤ پر چلا جاتا ہے''۔ اور اس کے بعد باتوں ہی باتوں میں یہ نصیحت بھی موجود ہے کہ ''بھائی گھاٹ کے آس پاس تیرنا اچھا ہے اور ایسا تیرنا کچھ نہیں کہ پانی کی مچھلی بن جائے۔'' آزاد نے مسلسل یہ کوشش کی ہے کہ بچوں کی جسمانی، ذہنی اور روحانی صحت کی پرورش کی جائے۔ کھیلوں ہی کو لیجئے۔ صبح کی سیر، تیراکی، پہلوانی اور نیزہ بازی کا ذکر بڑے ذوق شوق سے کیا ہے۔ تاش، چوسر، گنجفہ، شطرنج، کا کہیں نام بھی نہیں لیا۔

جب سے یہ کتابیں نصاب تعلیم سے خارج ہوئی ہیں، ابتدائی مدارس میں اردو کی تعلیم آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے ہی ہٹی ہے۔ بقول محمود شیرانی مرحوم ''خدا جانے ہمارے بچے کیوں ان لافانی شاہکاروں کے مطالعے سے محروم کردیئے گئے ہیں۔'' آج حالت یہ ہے کہ ان کتابوں کا ایک آدھ نسخہ بھی مشکل سے دستیاب ہوتا ہے۔ کہیں سے مل جائے، تو اسے اپنی خوش قسمتی سمجھئے۔

میری ایک مدت سے آرزو تھی کہ آزاد کے ان شاہکاروں کو دوبارہ شائع کرکے موجودہ نسل کی خدمت میں پیش کیا جائے۔ پہلے پہل یہ کتابیں میری درخواست پر اردو ٹرسٹ کے کے اشاعتی پروگرام میں شامل کی گئیں لیکن جب اردو ٹرسٹ مرحوم ہوگیا تو انہیں ترقیٔ اردو بورڈ کے پروگرام میں منتقل کیا گیا۔ اب کسی مرتب کی ضرورت تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ اسلم فرخی صاحب نے جو آزاد کے ادبی کارنامے کے بارے میں ایک محقق کی حیثیت رکھتے ہیں، اس کام کا بیڑا اٹھایا۔ ترقیٔ اردو بورڈ آن کی توجہ اور کوشش کا ممنون ہے۔

ان کتابوں میں تیسری کتاب کے متعلق شک تھا کہ یہ آزاد کی تصنیف ہے یا نہیں۔

حسن اتفاق سے اصل مسودے کے چند اجزا جناب آغا باقر کے پاس محفوظ تھے، جن سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اردو کی پہلی، دوسری اور چوتھی کتاب کی طرح تیسری کتاب بھی آزاد ہی کی تصنیف ہے۔ اس کے علاوہ اس امر کی شہادت ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم سابق صوبہ پنجاب کے دفتر میں بھی موجود ہے۔

بہر حال یہ چاروں کتابیں اب آپ کے سامنے ہیں، خوش قسمت تھے کرنل ہالرائڈ اور انگریزی حکومت جنھوں نے یہ کتابیں آزاد سے لکھوائیں اور شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار میں اپنے لئے ایک جگہ حاصل کرلی۔ اگرچہ آزاد جدید اردو نظم کی تحریر کے بھی بانی ہیں، اور ان کی نظم کے چند نمونے ان چاروں کتابوں میں بھی موجود ہیں، مگر واقعہ یہ ہے کہ ان کا اصل میدان نثر تھا، اور نثر کے اعتبار سے یہ کتابیں صرف بچوں کی درسی کتابیں ہی نہیں بلکہ ان کی ادبی حیثیت بھی غیر معمولی طور پر بلند اور پائدار ہے۔ یہ وہ ادب ہے جو زندگی سے بہت قریب ہے، اور جس سے بچے، جوان اور بوڑھے یکساں لطف اٹھا سکتے ہیں۔ یہ بھی آزاد کے کمال کا ایک پہلو ہے۔ سچ یہ ہے کہ اردو نثر میں وہ یکتا ہیں، اور ان سا کوئی اور نہ ہوا ہے، نہ ہوگا۔

باغ و بہار

(میر امن)

مرتبہ:

ممتاز حسین

ڈنکن فاربس کے مرتب کردہ نسخہ مطبوعہ ۱۸۴۷ ع

پر مبنی مع مقدمہ، فرہنگ و حواشی

نفیس ٹائپ کی طباعت، میر امن کی کلاسکی داستان کا سب سے مستند اور بہتر نسخہ

قیمت مجلد ۲/۵۰ روپے

ترقی اردو بورڈ

اردو منزل، جمشید روڈ، کراچی - ۵

سے طلب کریں

بچوں کے لئے موزوں کتابوں کی ضرورت

بیگم شائستہ اکرام اللہ

میں بچوں کے لئے موزوں کتابوں کی کمی پر عرصے سے توجہ دلانے کی کوشش کر رہی ہوں ، کیونکہ میرے نزدیک بچوں میں اپنی تاریخ، اپنی روایت اور اپنی ثقافت کے احساس کے لئے یہ ضروری ہے کہ بچپن ہی سے ان کے لئے دل‌نشیں انداز میں ایسی کتابیں ہوں جو ان میں یہ جذبہ پیدا کر سکیں۔ لیکن افسوس کہ اردو میں بچوں کے لئے ایسی کتابوں کا فقدان ہے ، اور اس کا نتیجہ یہ ہورہا ہے کہ نئی پود اپنی قدروں ، اپنی طرز معاشرت سے اور انداز فکر سے بالکل بے بہرہ ہوتی جارہی ہے۔ اب سے چالیس پچاس سال آگے اس کمی سے اس قدر نقصان نہیں ہوتا تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اگرچہ کتابیں نہیں تھیں تو نانی، دادیاں، انّا، مغلانیاں زبانی قصّے کہانیاں پہیلیاں وغیرہ بچوں کو سنایا کرتی تھیں - بات بات میں خدا رسول کا قصہ ، مذہب کی باتیں، بچوں کے ذہن نشین کرتی رہتی تھیں۔ اور چھوٹے بچوں کے لئے تو زبانی قصہ سننا پڑھنے سے کہیں بہتر ہے کیونکہ اس‌طرح سے کہنے والا ان کو زیادہ دلچسپ اور ان کے حسب دل‌خواہ بناسکتا ہے۔ لیکن نانیاں دادیاں تو اب سوشل سروس اور پولٹکس میں مصروف ہیں اور انّا، مغلانیاں دنیا سے ناپید ہوچکیں۔ بیچارے بچوں کو قصہ کہے اور سنائے تو کون؟ ایک طرف تو یہ ہوا، دوسری طرف سے انگریزی میں دیدہ زیب اور دلچسپ کتابوں نے اردو سے اور ان کا دل اچاٹ کیا۔ پہلے تو یہ ہوتا تھا کہ بچّہ بچپن میں قصے کہانیاں پرچے میں پڑھتا آیا، منتخب‌الحکایت، چند پند اور دو چار بچوں کی کتابوں کے بعد ہی اردو کی کتابیں پڑھنی شروع کردیں۔ کچھ سمجھ میں آیا کچھ نہیں آیا، لیکن استعداد بڑھتی گئی۔ تیرہ چودہ سال تک غالب اور اینی تک پہنچ گئے، لیکن اب متمول گھرانوں کے بچوں کو اردو سے پہلے انگریزی پڑھائی جاتی ہے، اردو ایک ثانوی زبان کے طور پر الگ‌سے پڑھتے ہیں۔ اردو میں حرف شناسی کے بعد بچے کو ایسی کتابیں نہیں ملتیں جن کو وہ دلچسپی سے پڑھ سکیں، اس لئے انہیں اردو سے انس نہیں پیدا ہوتا ۔ گھروں

کا ماحول بھی بدل چکا ہے۔ شعر شاعری، بیت بازی کی جگہ ریڈیو اور سنیما نے لے لی ہے، اس لئے بچے اردو سے نابلد ہوتے جاتے ہیں، لیکن قومی زبان سے واقفیت کے بغیر کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی۔ ہماری، مخصوص قدریں، ہمارا خاص انداز فکر ہماری اپنی زبان میں ہی ادا ہوسکتا ہے۔ اس کی اہمیت کا ہمیں پورے پورے طور پر احساس نہیں۔ جن بچوں کو زبان کھولتے ہی انگریزی نرسری رائمس لکھائے اور پڑھائے جاتے ہیں ان کی ذہنی نشوونما میں ایک عجیب تضاد پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آئندہ چل کر وہ کسی قسم کے تخلیقی کام سے معذور رہتے ہیں۔ ہماری زبان، ہمارے تمدن اور اپنی تہذیب کی آئینہ‌دار ہے۔ اپنی معاشرت کی تصویر اسی میں کھینچی جاسکتی ہے۔ بھلا سوچئے تو سہی کہ ہمارے بچے انگریزی کتابوں میں برف باری کے سین، مسلسل بارش کی شکایت، آگ کے آگے بیٹھ کر قصہ سننے کا بیان پڑھتے ہیں، اور رہتے ہیں ایسے ملک میں جہاں سال کے بیشتر حصے میں گرمی پڑتی ہے، جہاں گرمیوں کی چاندنی رات بڑی سہانی ہوتی ہے، جہاں بارش باران رحمت سمجھی جاتی ہے۔ بچے پڑھتے ہیں کرسمس کا ذکر، کرسمس پڈنگ کی تعریف، اور مناتے ہیں عید، جس میں سویاں کھائی جاتی ہیں، پلاؤ پکتا ہے۔ ذرا سوچئے تو سہی بچوں کے ذہن میں اس سے کیسی کشمکش اپید ہوتی ہوگی۔ ان کی کتابی دنیا میں اور ان کی اصلی دنیا میں کوئی بھی مطابقت تو نہیں ہوتی۔

جن کی تعلیم سولہ آنے انگریزی اسکولوں میں ہوتی ہے ان کو کم سے کم انگریزی پر مکمل عبور تو ہوجاتا ہے لیکن جن کی ادھوری انگریزی تعلیم ہوتی ہے، ان کو ذہنی کشمکش کا سامنا ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ بھی لگانا مشکل ہے۔ ایک نتیجہ میں نے ناقص انگریزی تعلیم کا یہ دیکھا کہ جن کو زبان کے نشیب و فراز سے واقفیت نہیں ہوتی وہ انگریزی گفتگو کرتے ہیں تو عجیب اکھڑپن سے اور جیسے ہی اردو میں گفتگو کیجیئے، نہایت مہذب طریقے سے باتیں کرتے ہیں۔ فون تار وغیرہ کے سلسلے میں، میں نے کئی بار یہ آزما کر دیکھا کہ جہاں اردو میں بات شروع کی، اکسچینج وغیرہ بدتمیزی سے باتیں کرنے لگے — ان کی بدتمیزی ان کی کم‌مائگی کی وجہ سے تھی۔ اپنی زبان سے ناواقفیت اور بھی کئی طرح کے نفسیاتی نقصانات پہنچاتی ہے۔ اس کا ذکر یہاں باعث طوالت ہوگا، اس وقت صرف اتنا کہنے پر اکتفا کرتی ہوں کہ بچوں کے لئے موزوں کتابوں کا فراہم کرنا نہایت ہی اہم قومی فرض ہے۔ ان کے لکھنے اور لکھوانے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیئے۔ انعامات کے ذریعے سے مصنفوں کو بچوں کی کتاب لکھنے پر آمادہ کرنا چاہیئے۔ سیرو تاریخ و جغرافیہ کی کتابیں ترقی' اردو کے

اداروں کو اپنے زیر نگرانی لکھوانی چاهیئں۔ اور ان سب سے زیادہ اهم اور ضروری کام یہ ہے کے جو چند گھر کی بڑی بوڑھیاں باقی هیں، ان کی زبانی پرانے قصے کہانیاں سن کر قلمبند کریں ، ورنہ وہ بہت جلد ناپید هوجائیں گی۔ بلکہ جیسا کہ حکیم حبیب الرحمان مرحوم نے ڈھاکہ کے خاص کھانوں کے نسخوں کے متعلق کہا تھا کہ یہ پکانے والیوں کے ساتھ پیوند خاک هوچکے، اکثر پرانے قصے کہانیاں اور پہیلیاں کہنے والیوں کے هاتھ بھی زیر خاک هو چکے هیں اور اب کسی قیمت پر مل نہیں سکتے ۔ لہذا قبل اس کے کہ یہ بے بہا سرمایہ بالکل هی برباد هوجائے خدا کے لئے کچھ کیجیئے۔

رسوم دہلی

تصنیف

مولوی سید احمد دهلوی

(مؤلف فرهنگ آصفیہ)

مرتبہ

ترقیٔ اردو بورڈ، کراچی

جس کے ساتھ مؤلف کی حیات و سیرت پر سید یوسف بخاری کا ایک مقالہ اور ایک فرهنگ شامل ہے ۔

ٹائپ کی دیدہ زیب طباعت

قیمت مجلد ۷ روپے

ناشر

اردو اکیڈمی سندھ ، کراچی

اشتقاقیات

ڈاکٹر شوکت سبزواری

زبان کے بنیادی لفظ سے اس زبان کے دوسرے الفاظ کسی خاص قاعدے یا اصول کے مطابق بنائے جاتے ہیں - مثلاً " پڑھ" اردو زبان کا ایک بنیادی لفظ ہے - اس سے حسب ذیل الفاظ وضع ہوئے - پڑھنا، پڑھا ، پڑھتا ، پڑھنے والا، پڑھاکو، پڑھویا ، پڑھنت، پڑھائی انپڑھ وغیرہ -

ان میں "پڑھ" ریڑھ کی ہڈی کی طرح ہے جس کے اول یا آخر کچھ حروف بڑھا کر نئے بامعنی الفاظ وضع کر لئے گئے- اس فن کو جس میں بنیادی لفظ میں تصرف کے بعد نئے الفاظ وضع کرنے کے طریقے بتائے جائیں اردو میں خاص طور سے علم صرف کہتے ہیں- اس کا تعلق توضیحی لسانیات سے ہے- لیکن زبان کا کوئی لفظ بنیادی ہو یا غیر بنیادی ، کبھی ایک حال پر برقرار نہیں رہتا- برابر ادلتا بدلتا رہتا ہے- آج کچھ ہے، آج سے پہلے کچھ تھا، آج کے بعد کچھ اور ہو گا- مثلاً "پڑھ" کو لیجئے- آج سے پہلے یہ "پڈھ" تھا اور اس سے پہلے "پٹھ" - آئندہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ کون سی شکل اختیار کرے- اسی طرح "پڑھا" آج سے پہلے "پڑھیا" تھا اور اس سے پہلے " پٹھت -" انقلاب روزگار اور گردش لیل و نہار نے کاٹ چھانٹ کر پٹھت سے "پٹھی" بنایا ، "پٹھی" سے "پڑھیا" اور " پڑھیا " سے پڑھا - یہ کاٹ چھانٹ ایک قاعدے کے ماتحت ہوئی- ان قاعدوں کا علم جن کے تحت لفظوں میں تراش خراش ہوتی اور کٹ چھٹ کر وہ اپنی موجودہ شکل میں آتے ہیں علم الاشتقاق یا اشتقاقیات ہے- اس شعبۂ علم کا تعلق تاریخی اور تقابلی لسانیات سے ہے - جب تک لسانیات کے خاص اس شعبے کا علم نہ ہو ، زبان کے عہد بعہد ارتقائی دوروں پر نظر نہ رکھی جائے، وہ صوتی تغیرات پیش نظر نہ ہوں جو زبان کے اولین دور (مثلاً اردو کے باب میں پراکرت) سے لے کر دور بدور آج تک کے جملہ انقلابات و تغیرات میں کارفرما رہے ہیں'

اس وقت تک کسی لفظ کی اصل متعین کرنا یا اس سلسلے میں کوئی رائے دینا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔

لسانی تغیرات کے ان اصول و قواعد سے بے خبر ہونے یا انھیں نظر انداز کر دینے کی وجہ سے ہم کبھی کسی لفظ کی اصل دریافت کرنے میں ٹھوکر کھا جاتے ہیں اور حقیقت تک ہماری رسائی نہیں ہوتی۔ مثلاً 'بیوہ' 'بیوی' 'بیاہ' یہ تین الفاظ اتنے ملتے جلتے اور حروف و حرکات میں ایک دوسرے کے شریک ہیں کہ ہر شخص یہ شبہ کرسکتا ہے کہ یہ الفاظ اصلاً مشترک ہیں اور کسی ایک بنیادی لفظ میں تصرف و تغیر کے بعد وجود میں آئے۔ چنانچہ ایک صاحب نے اپنے ایک مقالے میں اس خیال کا اظہار فرمایا بھی ہے کہ یہ الفاظ ایک خاندان کے ہیں۔ حالانکہ ان میں کسی قسم کا رشتہ نہیں۔ یہ تین الفاظ تین گھرانوں کے ہیں اور تینوں کی اصل جدا جدا ہے۔ ''بیوہ'' فارسی ہے۔ ''بیوی'' ترکی اور ''بیاہ'' پراکرتی۔ ''بیوہ'' کا مادہ قدیم ہند آریائی ''وِدھ'' ہے جس کے معنی ہیں ضرورت مند اور محتاج ہونا۔ سنسکرت 'وِدھوا' اسی مادے سے ہے۔ ''بیاہ'' اصل میں 'وِواہ' تھا۔ یہ سنسکرت مادہ ''وِوہ'' (وِ+وہ) سے لیا گیا ہے۔ اس کے اصلی معنی ہیں لے جانا (شادی کرنا)۔ یہ مادہ اس معنی میں رگوید میں استعمال ہوا ہے۔ ''بیوی'' ترکی بی بی کی تحریف ہے اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ یہ لفظ مسلمانوں کے ساتھ برصغیر میں آیا۔ قدیم ہندی ادب میں اس لفظ کا استعمال نظر سے نہیں گذرا۔ اردو میں بھی غالباً انیسویں صدی عیسوی کے آخر سے یہ استعمال ہوا ہے۔

اتوار بےشبہ سنسکرت آدتیہ وار کا بگاڑ ہے جو آدتیہ (= سورج) اور ''وار'' (= دن) کی ترکیب سے وجود میں آیا۔ بعض حضرات نے ''وار'' کے معنی والا لکھے ہیں۔ یہ درست نہیں۔

اُچاپت کے معنی ہیں اُدھار، اعتبار پر روزانہ ضرورت کی چیزوں کا لین دین۔ خود اُدھار اور اُدھار پر لی جانے والی چیز کو بھی اُچاپت کہتے ہیں۔ ہندی شبد ساگر کے مصنفین اس لفظ کی اصل کا کھوج نہ لگا سکے۔ وہ اسے ''دیشی''، یعنی غیر آریائی اور قدیم ہندوستان کی کسی زبان کی پیداوار بتا کے آگے بڑھ گئے۔ پلیٹس کا خیال ہے کہ یہ سنسکرت اُدیاپِت (= طے شدہ) کا بگاڑ ہے۔ اول الذکر سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا۔ عام طور سے پراکرت گرامر لکھنے والے جس لفظ کی اصل متعین نہیں کر سکتے اسے ''دیشی'' کہہ دیتے ہیں۔ جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ وہ ہندوستان کی کس غیر آریائی زبان سے لیا گیا ہے، اس کی اصلی شکل کیا ہے اور اس کے کیا معنی ہیں اس وقت تک ایک تحقیق کرنے والے کے جذبۂ تحقیق کو آسودگی حاصل نہیں ہوتی۔ ثانی الذکر پر سب سے بڑا اعتراض یہ

ہے کہ ”د“ اور ”ی“ مخلوط التلفظ ہوں تو صوتی طور سے وہ ”ج“ کی شکل اختیار کر سکتے ہیں۔ زیر نظر لفظ میں اولاً ”د“ اور ”ی“ مخلوط نہیں ۔ دوسرے انہوں نے ”ج“ کی جگہ ”چ“ کی شکل اختیار کی ہے جس کی بظاہر کوئی معقول توجیہ نہیں کی جا سکتی ۔

ڈاکٹر ٹرنر اسے قدیم ہند آریائی ”آچ چاپیتَ“ سے ماخوذ بتاتے ہیں جو سنسکرت سابقہ ”آد“ اور مادہٗ ”چ“ (= چننا) سے بنے ہوئے فعل کا تعدیہ ہے۔ اس کے معنی ہیں وہ جمع کراتا ہے۔ صوتی اور معنوی دونوں اعتبار سے یہ اشتقاق مجھے صحیح اور قرین قیاس نظر آتا ہے ۔

اچانک ناگاہ کے معنوں میں عام طور سے اردو میں مستعمل ہے ۔ اس کی ایک عوامی شکل آچانچک ہے ۔ ہندی شبد ساگر کے مصنفین نے اس کی تحقیق کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یا تو یہ سنسکرت سابقہ آ (= اچھی طرح) اور چک (= گردش) کی ترکیب سے وضع ہوا یا سنسکرت اگیانات (آجیانات) سے گھڑ لیا گیا جس کے معنی ہیں بے جانے بوجھے یا بے سمجھے۔ ڈاکٹر پلیٹس کی رائے میں یہ دونوں لفظ سنسکرت اگیاتک (=اجیاتک) کا بگاڑ ہیں۔ اگرچہ اس اشتقاق میں معنوی اعتبار سے کوئی سقم نہیں لیکن صوتی اعتبار سے ”ج“ کا ”چ“ سے تبادل جیسا کہ میں نے عرض کیا بڑی حد تک محل نظر ہے ۔

ڈاکٹر ٹرنر ایک قدیم ہند آریائی لفظ اَچّ کی نشان دہی کرتے ہیں جس کی ایک شکل آچّکّ (چ اور ک مشدد) بھی ہے ۔ اس لفظ کے معنی ہیں اچانک صدمہ ۔ یہ لفظ گجراتی ”اچک ووں“ (= روکنا) اور مرہٹی ”آنچکا“ (=اچانک کشش) کی اصل ہے ۔ اردو 'اچانک' اس لفظ کی دوسری شکل 'اچک' سے لیا جاسکتا ہے اور ' اچانچک ' آنچ ، اور آچک، کی ترکیب کا نتیجہ ہو سکتا ہے ۔ رہا غنہ سو وہ طرز ادا اور تلفظ کی پیداوار ہے۔

اچھ دکنی اردو میں 'ہونا' اور 'رہنا' کے معنوں میں عام طور سے مستعمل تھا ۔ اب متروک ہے ۔ دکنی اردو کے علاوہ یہ فعل بنگالی ، گجراتی، بھوجپوری اور کوتلی میں مس بھی ہے۔ مرہٹی میں اس کی شکل ”اسْتے“ ہے۔ ڈاکٹر ٹرنر نے اسے قدیم ہند آریائی آکْشت سے مشتق بتایا ہے جو پراکرت میں 'آچھّت ہوا، اس کے بعد 'اچھّئی' اور پھر آچھے۔ لیکن ڈاکٹر چٹرجی ایک قدم آگے بڑھاکر ہند یورپی مادہ Ske+ES کو اس کی اصل قرار دیتے ہیں۔ اس کے مختلف ارتقائی منازل یہ ہوں گے ۔

es·sketi acchati acchai ache

پراکرت میں ”س“ اور ”چھ“ میں عام طور سے تبادل ہوا ہے اس لئے کیا یہ ممکن نہیں کہ سنسکرت ”آستے“ (=وہ بیٹھتا ہے) اس کی اصل ہو ۔ جو پالی میں آچھّتِ ہے اور ہونے رہنے کے معنوں میں مستعمل ہے ۔

مراسلات

عزیزی و محبی شان‌الحق

السلام علیکم

''اردو نامہ'' کے پچھلے شمارے میں آپ نے مرحوم راس مسعود پر دو مضامین شامل کرکے قوم کی طرف سے اس محسن عظیم کا بہت بڑا قرض ادا کیا ہے۔ افسوس کہ ہم مردہ پرست تھے اور جیتے جی اپنے بزرگوں کے کمالات کا اعتراف نہیں کرتے تھے۔ مگر افسوس تو یہ ہے کہ ہم مردہ پرست بھی نہیں رہے۔ یوں تو راس مسعود کو اس جہاں سے سدھارے کم و بیش پچیس سال ہوگئے اور اس جیسے جسمانی کے علاوہ ثقافتی اعتبار سے بھی دیو قامت انسان' مسلم نوجوانوں کے بہی خواہ اور تعلیم و زبان اردو کے خدمت گزار کے بارے میں ہم نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا کہ انجمن ترقی' اردو نے ''اردو'' سہ ماہی کا ایک ''مسعود نمبر'' نکالا تھا یا مرحوم کے چند دوستوں اور نیازمندوں کی طرف سے کچھ سطور یا دو ایک نظمیں شایع ہوئیں اور بس۔ خدا جزائے خیر دے آپ کو کہ اپنے رسالے کے سابقہ شمارے میں آپ نے مرحوم پر دو نہایت بیش قیمت مضامین شایع کئے۔

جمیل نقوی صاحب کا مضمون مرحوم پر مجھے خاص طور پر پسند آیا۔ حق یہ ہے کہ انہوں نے لکھنے کا حق ادا کیا ہے۔ انہیں مرحوم سے قرابت کی بنا پر ان پر لکھنے کا حق بھی پہنچتا تھا۔ میں نے مرحوم کی وفات کے بعد ہی ایک نظم لکھی تھی جو شملے کے ایک یادگار جلسے میں جس کی صدارت اس زمانے کے رکن تعلیم حکومت ہند، کنور جگدیش پرشاد نے کی تھی، پڑھی تھی۔ وہ کئی اخبارات میں شایع بھی ہوئی تھی۔ اس نظم کا ابتدائی شعر یہ تھا:

پوچھے نہ کوئی مجھ سے مرا حال خدا را
غم دل پہ ہے ایسا کہ بیاں کا نہیں یارا

اس نظم کی خاطر بابائے اردو نے اپنا اصول توڑ دیا تھا یعنی اگرچہ شائع ہوچکی تھی مگر ''اردو'' کے مسعود نمبر میں شامل کی تھی۔ محبی خواجہ غلام السیدین نے بھی انگریزی

میں ایک مضمون لکھا تھا جو اخبار ''مسلمان'' کلکتہ میں شائع ہوا تھا۔ اس کی ایک نقل کہیں میرے پاس پڑی ہے۔

مجھ پر مسعود مرحوم کے بڑے احسانات ہیں۔ انہوں نے میری زندگی کے مدارج میں بڑا حصہ لیا تھا۔ میں نے اپنے مرتب کردہ ''دیوان بیدار'' (میر محمدی بیدار دہلوی معاصر میر و سودا) کا جسے ہند ستانی اکیڈمی یوپی، الہ آباد نے ۱۹۳۶ء میں شایع کیا تھا، مرحوم کے نام انتساب کیا تھا۔ ایک مضمون بھی ان پر اس زمانے میں شروع کیا تھا جو افسوس کہ اب تک نا مکمل پڑا ہے۔ دیکھئے ''غم روزگار'' مجھے کب فرصت دیتا ہے کہ پھر ''غم جاناں'' کو لے کر بیٹھوں (۱) اور اس مضمون کو مکمل کروں۔ مگر نقوی صاحب کے مضمون میں مجھے بعض مقامات پر کچھ خلا محسوس ہوا، اس لئے ان چند سطور میں مختصراً کچھ عرض کئے دیتا ہوں۔ میرا مضمون زندگی نے وفا کی تو اپنے وقت پر تیار ہوگا۔ ان سطور کو نقوی صاحب کے مضمون کا تتمہ، ضمیمہ یا اس کے بعض مقامات کے حواشی سمجھ کر مناسب سمجھیں تو ''اردو نامے'' کی آئندہ اشاعت میں شامل کرلیں۔

۱۔ نقوی صاحب نے مسعود کے علی گڑھ یونیورسٹی کی وائس چانسلری کے دوران میں جملہ وصول شدہ امدادی رقم کا ایک جگہ پر اندازہ ۲۷ لاکھ روپیہ اور اس کے بعد ہی ۳۰ لاکھ روپیہ کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ موخرالذکر سے بھی کچھ زیادہ ہی تھی جس کی بنا پر علی گڑھ میں حیرت کی جاتی تھی کہ تیس لاکھ کی رقم جو حکومت سے یونیورسٹی چارٹر حاصل کرنے کی غرض سے جمع کرنا ضروری تھی وہ پوری قوم کی متعدد سالوں کی ان تھک کوشش کے بعد جمع ہوسکی تھی اور یہاں تنہا مسعود نے اپنے تین سال سے بھی کم مدت کے قیام میں اس سے زاید امداد یونیورسٹی کے لئے جمع کرلی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ان کے ذاتی اثر و رسوخ کا نتیجہ تھا کہ حکومت نظام، حکومت ہند اور دیگر عمائدین و والیان ریاست سے انہوں نے دیکھتے دیکھتے اتنی خطیر رقم حاصل کرلی۔ ان رقوم کے علاوہ وائس چانسلر فنڈ کے لئے بقول خود وہ اپنے احباب خاص کی، ''جیبوں پر ہاتھ'' ڈالتے تھے۔ یہ فنڈ تنہا انھیں کے زیر تصرف تھا جس رئیس سے جتنی چاہتے رقم لاتے اور جس طالب علم پر جس طرح چاہتے صرف کرتے۔ کچھ رقم مجھ پر بھی صرف ہوئی تھی۔ اس کا حساب نہ ان سے کوئی مانگتا نہ وہ کسی کو دیتے۔ یہ آمد و خرچ بجٹ کے مدات سے باہر تھے۔ یونیورسٹی کو انہوں نے اس طرح مالا مال کردیا تھا کہ لوگ کہتے تھے سرسید کو اس کی آدھی رقم بھی میسر آتی تو شادیٔ مرگ ہوجاتی۔

(۱) بیٹھوں گا لے کے میں غم جاناں کو پھر جلیل فرصت ملی ذرا جو غم روزگار سے

۲ - سائنس کالج کے قیام (جس کے سلسلے میں علاوہ شاندار عمارات کی تعمیر اور اور معملوں کے ساز و سامان کی فراہمی کے طبیعیات و کیمیا کے دو عہدے نظام پروفیسر کے پندرہ پندرہ سو روپے کے قائم کئے گئے تھے اور ریاضی اور نباتیات کے پروفیسروں کے نئے عہدے ایک ایک ہزار روپے ماہوار کے نکالے گئے تھے - ان جگہوں پر قابل ترین اشخاص کا تقرر ہوا تھا) کے ساتھ ساتھ مسعود کی وائس چانسلری کے زمانے کا خاص الخاص واقعہ علی گڑھ میں مشہور مستشرق ڈاکٹر کرانکاڈ کا بہ حیثیت پروفیسر اسلامیات کے تقرر تھا - عربی میں ڈاکٹر ٹرٹن کے چلے جانے کے بعد مخدومی علامہ عبدالعزیز میمن کی آمد بھی خاص واقعہ ہے -

۳ - اردو کے سلسلے میں نقوی صاحب کے مضمون میں صاف صاف یہ تصریحات رہ گئی ہیں کہ مرحوم علی گڑھ کی سابقہ خدمات و روایات کے پیش نظر اس زمانے کے شعبۂ اردو سے مطمئن نہ تھے کیونکہ اس وقت صرف رسمی طور پر اردو ، انٹرمیڈیٹ اور بی اے کے امتحانات میں لازمی تھی اور بس ، جس میں مدرسین کے لئے برائے نام سا کورس انتخابات وغیرہ کا مقرر تھا - بعض لڑکے غیر مادری اردو لے کر اردو سے بےنیاز ہوجاتے تھے - یہ مرحوم ہی کی ذات تھی جس نے اردو میں ایم اے اور آنرز کی جماعتیں علی گڑھ میں قائم کیں - تدریس کا نصاب بنوایا اور شعبۂ اردو میں ایک ریڈری کی جگہ نکالی جس پر رشید صاحب کا تقرر ہوا - (اس سے پہلے موصوف لکچرر تھے - یہ انتخاب ایک تقرراتی کمیٹی نے کیا تھا جس کے یونیورسٹی سے باہر کے دو مشہور فعال ارکان علامہ سید سلیمان ندوی اور ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحومین تھے - اسی کمیٹی نے مولانا احسن مارہروی مرحوم اور خاکسار راقم کو علی الترتیب بہ حیثیت سینیر و جونیر لکچرر منتخب کیا تھا) -

۴ - مرحوم نے مجھ سے کئی بار یہ خیال بھی ظاہر کیا تھا کہ وہ علی گڑھ میں عثمانیہ یونیورسٹی سے زیادہ بڑے پیمانے پر ایک دارالترجمہ قایم کرنے کا خیال رکھتے ہیں - افسوس کہ ان کی اس آرزو کو پورا ہونے کا وقت نہ آسکا اور وہ یونیورسٹی سے علیحدہ ہوگئے -

۵ - ''ناگزیر حالات کی وجہ سے وائس چانسلری سے استعفیٰ دے دیا'' میں ایک جہان معنی پوشیدہ ہے جس کی کچھ تفصیل ضروری ہے - عام طور پر لوگ اس زمانے کے واقعات سے ناواقف ہیں یا جو واقف تھے بھول گئے ہیں - بات یہ ہے کہ مسعود مرحوم علی گڑھ اس وقت آئے تھے جب ڈاکٹر ضیاءالدین مرحوم پرو وائس چانسلر کو اس تحقیقاتی کمیٹی کی سفارشات کے بموجب علی گڑھ سے سبکدوش کیا گیا تھا جو ہز ہائی نس بیگم صاحبہ بھوپال نے (حکومت ہند کی علی گڑھ سے بے اطمینانی (۱) کی بنا پر) مقرر کی تھی - چونکہ اس کمیٹی نے ڈاکٹر صاحب

(۱) اس زمانے کا علی گڑھ کیا رہ گیا تھا اور وہ خرابیاں کیوں آگئی تھیں، ایک الگ داستان ہے جو بعد میں کبھی انشاء اللہ بیان ہوگی -

مرحوم، ان کے ہوا خواہوں اور آوردوں کو علی گڑھ کی تمام خرابیوں کا ذمہ دار قرار دیا تھا، اس لئے نئے وائس چانسلر کے لئے علی گڑھ کو اس قسم کی فضا سے پاک رکھنا ضروری تھا۔ اپنے تین سال کے قیام میں مسعود نے علی گڑھ کی تمام سابقہ خرابیوں کو دور کیا، فضا بدل دی اور نئے طلبہ میں حریت اور وطن پرستی کے جذبات کی ہمت افزائی کی مگر یہ آخری بات علی گڑھ کی تمام سابقہ روایات کے خلاف سمجھی گئی اور اس زمانے کے نہایت متشدد اور جابر وائس رائے لارڈ ولنگڈن کو جو یونیورسٹی کا رکٹر (Rector) تھا سخت ناگوار ہوئی۔ حکومت ہند علی گڑھ کی تمام سابقہ خرابیوں کو جن کی بنا پر تحقیقاتی کمیٹی بنائی گئی تھی بھول گئی اور ہندوستان کی جنگ آزادی کے اس پر آشوب دور میں اسے یہی مناسب معلوم ہوا کہ علی گڑھ کو کسی قیمت پر ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب مرحوم ضیاء الدین احمد کو اب بہ حیثیت وائس چانسلر علی گڑھ میں واپس بھیجنا طے ہوا، تاکہ یونیورسٹی پر انگریز کا دباؤ قایم رہے۔ ولنگڈن نے سر فضل حسین مرحوم کو جو اس زمانے میں حکومت ہند کے ممبر تعلیم تھے اشارہ کیا جن کی ہدایات اور فہمائش پر حکومت ہند کے جملہ ملازمین اور افسر جو علی گڑھ یونیورسٹی کورٹ کے ممبر تھے ایک خاص چارٹرڈ ہوائی جہاز پر محض راس مسعود کو شکست دینے کورٹ کے اجلاس میں آئے اور اس فرض کو ادا کرتے ہی دہلی واپس چلے گئے۔ وائس چانسلر کا انتخاب تو بعد کا سوال تھا۔ جس مد پر مسعود نے ہوا کا رخ بھانپ کر عقلمندی سے استعفیٰ دے دیا وہ یہ تھی کہ وہ اپنے نامزد رجسٹرار مسٹر ایف احمر (فخر الدین احمر، بی ای ایس) کو جو سابق میں ان کے اصلاحی کاموں میں دست راست رہ چکے تھے دوبارہ منتخب کرانا چاہتے تھے مگر سرکاری ارکان کورٹ اور ان کے ہم خیال اصحاب نے ان کے خلاف مسٹر عظمت الہیٰ زبیری کو جو ڈاکٹر ضیاء الدین کے دست راست رہ چکے تھے اور دفتر رجسٹرار میں مسٹر ایف احمر کے ماتحت تھے، رجسٹرار منتخب کرادیا۔ مسعود کس طرح استعفیٰ نہ دیتے۔ کیا اس کا انتظار کرتے کہ انہیں لوگوں کے ہاتھوں جنھوں نے ان کے نامزد امیدوار کے بجائے ڈاکٹر ضیاء الدین کے امیدوار کو رجسٹرار بنا دیا اپنی وائس چانسلری کے انتخاب میں شکست کھاتے۔ انھیں یہ موقع ہاتھ آیا کہ ان کے نامزد امیدوار کی بہ حیثیت رجسٹرار انتخاب میں ناکامی کورٹ کے خود ان حضرات پر عدم اعتماد کے برابر ہے، اس لئے وہ وائس چانسلر نہیں رہنا چاہتے۔ مسعود کے استعفیٰ کا ذکر بابائے اردو کے خطوط بنام ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نیز بعض دیگر اصحاب میں ملتا ہے لیکن وضاحت سے یہ واقعہ آج بہت سے لوگوں کو معلوم نہیں۔ بہرحال مسعود کا علی گڑھ سے یوں چلا جانا علی گڈھ کی روایات کے مطابق تھا جہاں قابل سے قابل آدمی بطور سربراہ بلایا جاتا اور ناقابل ترین بنا کر نکالا جاتا تھا۔ وہ استعفیٰ دے کر کم از کم اس

کھلی ہوئی بے عزتی سے بچ گئے -

۶ - یورپین لوگوں سے مسعود کے عدم مرعوبیت کا حال مسٹر فارسٹر نے اپنے مضمون میں لکھا ہے - واضح ہو کہ یہ واقعہ ۱۹۰۴ء یا اس کے لگ بھگ کا ہے جب مسعود بہ حیثیت طالب‌علم ولایت میں مقیم تھے اور اس زمانے میں انگریز کی فرعونیت آسمان سے باتیں کررہی تھی - ایک غلام قوم کا فرد فرانس کی ایک ٹرین میں رات کے وقت برتھ پر لمبا لمبا لیٹ جاتا ہے اور سو جاتا ہے - ایک اسٹیشن پر ایک سفید چمڑے والا ٹرین میں داخل ہوکر مسعود کو جھنجھوڑتا ہے - اسے حیرت ہوتی ہے کہ اس کے وطن میں اس طرح جگہ گھیرنے کی اس "کالے" کو کس طرح ہمت ہوئی - مسعود ایک بار تو طرح دے جاتے ہیں اور اسی ٹھاٹھ سے لیٹے رہتے ہیں - جب وہ گورا بہت تنگ کرتا ہے تو کھڑے ہوجاتے ہیں ، اپنی آستینیں چڑھا لیتے ہیں اور گرج کر اس سے کہتے ہیں - "کیا تجھے ٹرین سے باہر پھینک دوں"؟ گفتگو فرنچ میں ہوئی ہوگی مگر انگریزی کے الفاظ یہ ہیں :

"Do you want to be thrown out of the train?"

ایک معمولی انگریز شاید اپنے وطن میں اچھا بھلا انسان ، ہندوستان آکر بلا وجہ فرعون بے سامان نہیں بن جاتا تھا - حاکمیت کا اقتدار برقرار رکھنے اور رعایا کے دل میں کپکپی پھیلانے کی غرض سے اسے تربیت ہی ایسی دی جاتی تھی - اس کے ذہن کی ، دل و دماغ کی ساخت ایک خاص سانچے کی پیداوار ہوتی تھی - مسعود جو انگریز کی خو بو اور فطرت سے بخوبی واقف تھے وہ ہندوستان میں اس کی مجبوری ، معذوری کے پیش نظر اسے قابل رحم سمجھتے تھے - ان کے الفاظ یہ تھے : "They have all my sympathies" (میری تمام ہمدردیاں ان کے ساتھ ہیں) -

۷ - نقوی صاحب نے فارسٹر صاحب کی کتاب 'A Passage to India' کا ذکر نہیں کیا جو مصنف نے راس مسعود کے نام انتساب کی ہے - میرے علم میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ ایک انگریز مصنف نے کسی دیسی اور اپنے ہی غلام ملک کے باشندے کو اپنی تصنیف معنون کی ہو ، خاص کر اس زمانے میں کہ انگریز اور ہندوستان کی سطح میں معناً اور لفظاً دونوں طرح آسمان اور زمین کا فرق ہوتا تھا - اس کتاب کے ایک کردار ڈاکٹر عزیز میں مسعود کی جھلکیاں صاف نظر آتی ہیں وہ اسی قسم کی باتیں کرتے تھے جیسی یہ کردار کرتا ہے - "کیا دنیا کسی دوسری قوم کی ایسی مثال پیش کرسکتی ہے جس میں ہمارے مغلوں کی طرح ایک کے بعد ایک بلکہ ایک سے ایک بڑھ کر بلند بانگ ، قد آور ، آسماں گیر سلاطین گذرے ہوں . . . . اکبراعظم ، جہانگیر . . . . شاہ جہاں . . . . اورنگ زیب -

۸ - علامہ اقبال کے مسعود کے پاس بھوپال میں قیام کے سلسلے میں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ علامہ مرحوم اس زمانے میں سرمہ درگلو ہوگئے تھے اور بول نہ سکتے تھے۔ ایسی حالت میں علامہ سے علی گڑھ میں محبی خواجہ غلام السیدین کے ہاں میری بھی ملاقات ہوئی تھی۔ مسعود مرحوم نے علامہ کا بھوپال میں عرصے تک اس مرض کا علاج کرایا تھا۔

۹ - پانی پت میں مولانا حالی کے صد سالہ جشن کے روح رواں بے شک مسعود ہی تھے۔ یہاں یہ ضرور لکھنا چاہئے کہ اس موقع پر مسدس مدوجزر اسلام کا ایک خاص ''صدی ایڈیشن'' شایع ہوا تھا جو آج تک یادگار ہے۔

ایک بات رہی جاتی ہے ، مسعود پر دوسرے مضمون نوشتہ* نواب سعید جنگ میں 'A Passage to India' کے مصنف کا نام بار بار ''فارسٹر'' آیا ہے۔ ان کا صحیح نام مسٹر ای۔ ایم فارسٹر ہے یعنی 'ر' کے ساتھ۔ یہ صاحب غالباً ۱۹۴۵ء یا ۱۹۴۶ء میں ہندوستان تشریف لائے تھے ، اور مجھ سے ان سے پروفیسر ڈکسن (پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور میرے علی گڑھ کے استاد انگریزی) کے ساتھ لاہور میں ملاقات ہوئی تھی۔ والسلام خاکسار

جلیل قدوائی

اردونامہ

ہندوستان میں حاصل کرنے کا پتا

ہندوستان میں ''اردونامہ'' کے شائقین

رائٹرس امپوریم پرائیویٹ لمیٹڈ

خورشید بلڈنگ ، فیروز شاہ مہتا روڈ ، بمبئی - ۱

سے

رجوع کریں

یا براہ راست دفتر اردو نامہ اردو منزل ، جمشید روڈ ، کراچی کو چندہ ارسال فرمائیں

تبصرے

تاریخ اردو ادب، جلد اول

مرتبہ عبدالقیوم لیکچرار شعبۂ اردو، کراچی یونیورسٹی

صفحات (۴۰۷) تقطیع $\frac{1}{16}$ کراؤن۔

قیمت آٹھ روپے۔

ناشر۔ پاکستان ایجوکیشنل پبلشرز لمیٹڈ، کراچی۔ ۴

اردو زبان کی تاریخ پر اب تک کئی کتابیں لکھی جاچکی ھیں۔ اردو ادب کے معماروں نے آج سے تقریباً دو سو برس پہلے ھی اس کی اھمیت اور ضرورت کو محسوس کرکے تذکرہ نویسی سے اس اھم کام کی ابتدا کردی تھی۔ گلشن گفتار، نکات‌الشعرا، تذکرہ ریختہ گویاں، مخزن نکات، تذکرہ شعرائے اردو، چمنستان شعرا، گلزار ابراھیم اور تحفۃ الشعرا وغیرہ ۱۲۰۰ ھجری سے قبل لکھے گئے تھے، جن میں سے ابتدائی سات تذکرے کئی سال پہلے شایع ھوکر منظر عام پر آچکے ھیں۔ تحفۃ الشعرا مصنفہ مرزا افضل بیگ خاں قاقشال (۱۱۶۵ء) جس کے صرف تین مخطوطے (دو کتب خانۂ آصفیہ اور ایک کتب خانۂ سالار جنگ حیدر آباد دکن میں) محفوظ ھیں، ایک سال قبل تک ھماری آنکھوں سے اوجھل تھا، لیکن اب ڈاکٹر حفیظ قتیل نے اسے مرتب کرکے ادارۂ ادبیات اردو حیدر آباد دکن سے شائع کیا ھے۔ ان کے علاوہ آزاد کے تذکرہ آب حیات سے قبل ھندوستانی اور یورپی مصنفین کے لکھے ھوئے کئی تذکرے تالیف ھو چکے تھے۔ لیکن ان سب تذکروں میں اردو شاعروں کے حالات فارسی زبان میں قلمبند کئے گئے تھے۔ آب‌حیات اردو شاعروں کا اردو زبان میں پہلا تذکرہ ھے۔ ۱۹۱۴ء میں محمد یحیٰ تنہا نے "سیرالمصنفین" کی پہلی جلد اور ۱۹۲۴ء میں دوسری جلد شایع کی، جس میں انہوں نے اردو نثر نگاروں کے حالات اور ان کی تحریروں کے نمونے پیش کئے ھیں۔ اس کے بعد اور کئی ادبی تاریخیں لکھی گئیں جن میں صرف شاعروں یا نثر نگاروں کے حالات اور ان کے کلام اور تحریروں کے نمونے اور انداز کلام و طرز تحریر پر سرسری نظر ڈالی گئی ھے۔ ان میں کاشف‌الحقائق، جلد اول و دوم، خمخانۂ جاوید، جلد اول تا پنجم، ارباب نثر اردو، تاریخ نظم و نثر اردو، نمونۂ منثورات، شعرالھند، تاریخ ادب زبان اردو، داستان تاریخ اردو، مختصر تاریخ ادب اردو، اور رام بابو سکسینہ کی تاریخ

ادب اردو (انگریزی) اپنی اپنی حیثیت سے اہمیت اور افادیت کی حامل ہیں۔ بالخصوص رام بابو سکسینہ کی تاریخ ادب اردو (مترجمہ مرزا محمد عسکری) اپنی حد تک خاصی جامع اور مستند کتاب ہے۔ لیکن اس کے باوجود اردو زبان کے شایان شان تاریخ ادب اب تک نہیں لکھی گئی۔ یہ اہل اردو کی تغافل شعاری افسوس ناک ہے۔ اردو زبان میں آج تک ایسی جامع اور مستقل تاریخ ادب اردو نہیں لکھی گئی جو اس زبان کے آغاز سے موجودہ دور تک کے شعرا و مصنفین کے حالات زندگی اور ان کے انداز کلام و اسلوب نگارش پر محیط ہو۔ یہ ایک ایسی کمی ہے جس کی وجہ سے اردو، دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے دوش بدوش اپنا سر بلند نہیں کرسکتی۔

اردو زبان کی تاریخ بہت قدیم بھی ہے اور بہت وسیع بھی۔ اردو زبان و ادب کے معماروں کا دائرہ اتنا لا محدود ہے کہ اس کا احاطہ کرنا دو چار آدمیوں کے بس کی بات نہیں۔ برصغیر پاکستان و ہندوستان کا کون ایسا گوشہ ہے جہاں اہل قلم نے جنم نہ لیا ہو۔ اس لئے یہ کام چند افراد کی کوششوں سے سر انجام نہیں پاسکتا، اس کے لئے تو ایک بڑے اور منظم ادارے کی ضرورت ہے۔

زیر نظر تاریخ ادب اردو، جلد اول کی ضخامت کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی تھی کہ مدت کی آرزو شاید پوری ہوجائے گی لیکن اس کے صفحات کی ورق گردانی اور مطالعے کے بعد ہماری توقع پوری نہیں ہوئی۔ لائق مرتب نے خود ہی اپنے پیش لفظ میں اپنی اس تالیف کی بابت متعذرانہ لہجہ اختیار کیا ہے:

"اس تالیف کو حرف آخر نہیں سمجھنا چاہئے۔ کوشش کی گئی ہے کہ تاریخ ادب اردو کا وسیع نظریہ برقرار رہے۔ اس کے بعد بھی ایک تفصیلی تاریخ ادب کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ تقریباً آٹھ سو سال کی تاریخ کو مرتب کرنا کافی محنت طلب کام ہے۔ امید ہے کہ ارباب نظر اسے قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔"

پوری کتاب دس ابواب پر مشتمل ہے جن میں سے ابتدائی چار باب تاریخ ادب اردو سے غیر متعلق ہیں۔ "اردو نامہ" کی محدود گنجائش کو دیکھتے ہوئے، یہاں سرسری طور پر اس کتاب کے بعض اجزا کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

باب اول کے ابتدائی (۴۶) صفحات میں کوئی کام کی بات نظر نہیں آئی البتہ اس کے بعد کے (۹) صفحات ایسے ہیں جن میں اردو زبان کی پیدائش کے بارے میں مختلف اصحاب کے نظریوں کو پیش کیا گیا ہے۔ پانچویں باب میں بھی اردو زبان کے آغاز و ارتقا کے مختلف

نظریوں کو یکجا کردیا گیا ہے ، لیکن اس موضوع پر بعض اہم کتابوں مثلاً ہندوستانی لسانیات (ڈاکٹر زور) ہندستانی لسانیات کا خاکہ (مترجمہ احتشام حسین) اور آریائی زبانیں (ڈاکٹر سدھیشورورما) کا نہ تو بظاہر مطالعہ کیا گیا اور نہ ان کے حوالے دئے گئے۔ چھٹے ، ساتویں اور آٹھویں باب میں دکن کے شاعروں اور نثر نگاروں کے مختصر حالات اور ان کی نظم و نثر کے نمونے دئے گئے ہیں ۔ یہ حصہ غیر تشفی بخش ہے ۔ جگہ جگہ انشا کی غلطیاں ہیں اور جو اقتباسات دئے گئے ہیں ان کو صحیح پڑھ کر لکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی گئی۔ بعض سنین بھی غلط دئے گئے ہیں ۔ اور حیرت یہ ہے کہ سید محمد جونپوری کو دکنی شاعروں کے زمرے میں شریک کیا گیا ہے۔ نواں اور دسواں باب (۱۳۸) صفحات پر مشتمل ہے جس میں ۱۷۰۷ء تک کے شمالی ہند کے (۵۳) شاعروں اور (۴) نثر نگاروں کے حالات درج ہیں ۔ یہ ابواب جلد اول کے بجائے اگر دوسری جلد کی ابتدا میں ہوتے تو بہت مناسب تھا کیونکہ دکنی دور کے ختم کے ساتھ ہی اردو زبان اپنا چولا بدل لیتی ہے اور ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس حصے میں بعض ایسے شاعروں کو شامل کیا گیا ہے جو غالباً ۱۷۰۷ء کے بعد پیدا ہوئے یا انہوں نے اس وقت تک لکھنا شروع نہیں کیا تھا ۔ محمد شاکر ناجی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کم عمری میں ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کا سنہ وفات ۱۷۵۴ء ہے ۔ اگر (۵۰) سال کی عمر میں بھی ان کا انتقال ہوا ہے تو ان کی تاریخ پیدائش ۱۷۰۴ء قرار پائے گی ۔

اب تک ابتدائی دور کے اکثر شعرا و مصنفین کے سنین پیدائش و وفات متعین نہ ہو سکے ۔ ادارہ تحریر اگر یہ اہم کام انجام دے دیتا تو یہ بڑی خدمت ہوتی ۔

کتابت ، طباعت، انشا اور محاورے کی غلطیاں جگہ جگہ نظر آتی ہیں ۔ ہمارا یہ مشورہ ہے کہ تاریخ ادب اردو کی تدوین اعلیٰ علمی سطح پر ہونی چاہئے ۔ عجلت سے علمی کام کی وقعت گر جاتی ہے ۔پاکستان ایجوکیشنل پبلشرز اور تاریخ ادب اردو کے ادارہ تحریر کو چاہئے کہ اس کام پر نظر ثانی کریں اور آئندہ کے لئے ایک ایسا لائحہ عمل مرتب کریں کہ تاریخ ادب اردو صحیح معنوں میں اردو زبان و ادب کی تاریخ کہلائی جا سکے ۔ جب اس پہلی جلد کی دوسری اشاعت کی نوبت آئے تو اس کی بغور نظر ثانی کرکے موجودہ نقائص کو دور کردیا جائے ۔

خ ۔ ح ۔ ش

ترقیء اردو بورڈ کی مرتب کردہ چند مطبوعات

مرآۃالعروس — **ڈاکٹر مولوی نذیر احمد مرحوم** — **مع مقدمہ و فرہنگ**

مرتبہ

جناب ڈاکٹر بیگم شائستہ اکرام اللہ

ناشر ویسٹ پاک پبلشنگ کمپنی ، لاہور — **قیمت ۳ روپے**

منتخب الحکایات — **ڈاکٹر مولوی نذیر احمد مرحوم** — **مع مقدمہ و فرہنگ**

مرتبہ

جناب شاہد احمد دہلوی

ناشر ملک دین محمد اینڈ سنز ، لاہور — **قیمت ۲ روپے ۶۲ پیسے**

منازل السائرہ — **مصنفہ علامہ راشدالخیری مرحوم** — **مع مقدمہ و فرہنگ**

مرتبہ

جناب رازق الخیری

ناشر جنرل پبلشنگ ہاؤس بندر روڈ۔ کراچی — **قیمت ۵ روپے**

اردو لغت کی مجمل اشاعت

اردو لغت کے سابقہ اجزا جو ''اردو نامہ'' کے ساتھ ساتھ قسط وار چھپتے رہے ہیں ، چار آنے فی جزو کی شرح سے طلب کئے جاسکتے ہیں - جو اصحاب مکمل اجزا محفوظ رکھنا چاہیں ، بذریعہ وی پی جلد طلب فرمائیں -

مینجر

URDU DEVELOPMENT BOARD

ترقی اُردو بورڈ کی جامع، تاریخی و تحقیقی

اُردو لغت

(مختصر جلی نسخہ)

جلد اوّل : الفِ مقصورہ

(قسط نمبر ۸)

لغت کی اس مجمل اشاعت کا خاص مقصد یہ ہے کہ ادارہ مسودے کی تصحیح و تکمیل کے سلسلے میں اہل الرائے اصحاب کے مشوروں سے مستفید ہو سکے۔ ہمیں امید ہے کہ قارئین ''اردو نامہ'' ان صفحات کو تنقیدی نظر سے دیکھیں گے اور ہمیں اس کی فروگزاشتوں سے آگاہ کرنے میں دریغ نہ فرمائیں گے۔

شان الحق حقی
رکن و معتمد ترقیٔ اردو بورڈ

—اپنی راہ پہ ہونا (محاورہ)

ہر ایک کی روش اور وضع کا دوسرے سے مختلف ہونا، ایک دوسرے سے بے خبر ہونا

یہ وہ خرابہ ہے سب اپنی اپنی راہ پہ ہیں
کسی کو حال کسی کا سحر نہیں معلوم

۱۸۶۲ ریاض سحر ، ۵۵

—اپنی گانا (محاورہ) رک : "اپنی اپنی بولی (بولیاں) بولنا " (۳)

وجد میں آکے راگ صوفی لائیں
شیخ و زہاد اپنی اپنی گائیں

۱۸۷۶ سخن بے مثال ، ۱۵۵

—اپنی سمجھ ہے

(طنزاً) بہت احمق ہو (دریائے لطافت)

—اپنی گور اپنی اپنی منزل (کہاوت)

کوئی کسی کا شریک حال نہیں، ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمے دار ہے

آسماں پر روح ، تن زیر زمیں کیوں کر نہ جائے
اپنی اپنی گور اپنی اپنی منزل چاہیے

۱۸۴۶ آتش (بحوالۂ نور)

منزل ہے اپنی اپنی قلق اپنی اپنی گور
کوئی نہیں شریک کسی کے گناہ میں

۱۸۷۲ مظہر عشق ، قلق ، ۱۱۸

حضرت جانے دیجیے، معاف کیجیے اپنی اپنی گور اپنی اپنی منزل۔

۱۹۲۵ اودھ پنچ ، ۱۰ : ۳۷، ۱۰

—اپنی ہانکنا رک : "اپنی اپنی بولی بولنا " (۳)

یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ ایک شخص کی صاف آوار سنائی دیتی، ہر شخص اپنی اپنی ہانکتا تھا۔

۱۹۲۲ حاجی بابا ، ۹۰

—اڑھائی اینٹ کی مسجد الگ چننا (بنانا)

رک : **"اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ چننا "**

—اصالت (اصل یا اصلیت) پر جانا (محاورہ)

برتاؤ یا طرز عمل سے نیچ پن کا اظہار کرنا

سفلگی اور بڑھی رتبۂ عالی پاکر
اصل پر اپنی مگر پیر فلک جاتا ہے

۱۸۵۴ ذوق؟

ڈومنی کی تھی وہ بیٹی اصل پر اپنی گئی

۱۸۹۷ حان صاحب (بحوالۂ نور)

—اور تیری جان ایک کر دوں گا (محاورہ)

(دھمکانے کی غرض سے ، حود بھی مروں گا ، تجھے بھی ماروں گا ، میرا تیرا خون ایک ساتھ بہے گا۔

—اولاد سے پائے (عو)

۱۔ اس کی اولاد اس کے ساتھ برا سلوک کرے، ظالم کو ظلم کا بدلہ اس کی اولاد سے ملے۔ (کوسنے کے طور پر)

۲۔اس کی اولاد پر میرا صبر پڑے، اس کی اولاد کےآگے آئے

جو میری لگائی بجھائی اماں سے کرے وہ اپنی جان جوانی سے پائے، دبدے گھٹنوں کے آگے آئے، اپنی اولاد سے پائے۔

۱۸۸۳ طلسم ہوش ربا، ۱:۶۳۲

—ایڑی دیکھنا (عو) **(محاورہ)**

کسی عزیز شخص یا چیز کو نظر بد سے بچانا، نظر نہ لگانا، (کسی کو حد سے سوا سراہا جائے یا بہت زیادہ پسند کیا جائے تو نظر بد سے بچانے کے لئے ایڑی دیکھتے ہیں جو ایک طرح کا ٹوٹکا ہے)

جوں میں نے کہا کہ ہے کف پاپہ بہار
بولا وو نہیں ہنس کے اپنی ایڑی دیکھو

۱۸۱۰ جرأت (ق)، ۲۲۵

مادو نے اس کی صورت دیکھ کر اپنی ایڑی دیکھی۔

۱۸۹۷ انتخاب طلسم ہوشربا، ۳۸۶

نام خدا میں اپنی ایڑی دیکھوں، میرا میّی ہوشیار ہوا، پہننے اوڑھنے کا شعور ہوا۔

۱۹۱۱ قصۂ مہر افروز، ۲۵

—ایسی تیسی کرا لینا

اپنا ہی کچھ بگاڑنا، کسی کو نقصان پہنچانے کی ہوس میں خود ہی کو نقصان پہنچانا۔ م: میری شکایت کر کے اپنی ایسی تیسی کرالی۔

—آبرو اپنے ہاتھ ہے (کہاوت)

انسان کو خود اپنی عزت کا پاس کرنا چاہیے، دوسرے کو اس بات کا موقع نہ دے کہ وہ اسے ذلیل کرے۔ انسان اپنے ہی ہاتھوں سرخرو یا ذلیل و خوار ہوتا ہے۔

حضرت اپنی آبرو اپنے ہاتھ ہے، جبراً کام نہیں لیا جاسکتا۔

۱۹۳۳ اودھ پنچ، ۱۸: ۱۹، ۵۵

—آگ میں (آپ) جلنا (محاورہ)

۱۔ حسد کرنا، رشک کرنا۔

۲۔ تکلیف اٹھانا، سختیاں برداشت کرنا، غم کھانا۔

آگ میں اپنی مثال شمع جل
پر زباں سے اف نہ اے نادان کر

۱۸۷۶ سخن بے مثال، ۴۳

—آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا دوسرے کی آنکھ کا تنکا دیکھ لیتے ہیں (کہاوت)

اپنے بڑے عیب نظر نہیں آتے دوسرے کے معمولی قصور دکھائی دے جاتے ہیں، اپنا بڑے سے بڑا عیب، عیب نہیں رہتا، دوسرے کا معمولی قصور گناہ ہو جاتا ہے۔

—بات اپنے ہاتھ رک: "اپنی آبرو اپنے ہاتھ"

تم کو صحبت غیر سے دن رات ہے
دیکھو اپنی بات اپنے ہات ہے

۱۸۹۲ مہتاب داغ، ۱۸۷

ــبات پر آنا (آجانا) (محاورہ)

اپنے کہے کی پچ کرنا ، ضد یا ہٹ کرنا

جانتا ہوں مری نہ مانیں گے
آ گئے ہیں وہ بات پر اپنی

۱۹۰۵ یادگار داغ ، ۱۰۴

ــبات کا ایک (ہی) ہے (محاورہ)

قول پر قائم رہنے والا ہے

جانے ہی اس کے آئیو اے مرگ تو شتاب
جانے کہ یہ بھی ایک ہی ہے اپنی بات کا

۱۸۱۰ جرأت (بحوالہ امیر)

ــبات کا پورا ہونا (محاورہ)

قول کا پکا ہونا ،جو کہنا کر دکھانا ،

جو تجھ کو صلح کا ہے گا خیال جلد آجا
زیادہ پہلے سے ہوں اپنی بات کا پورا

۱۸۴۴ ترجمۂ گلستاں، ۹۸

لوجی مانا ہم نے تم پورے ہو اپنی بات کے

۱۸۶۴ د حافظ ہندی، ۲۱

ــباڑی پر آنا رک : " اپنی والی پر آنا "

ــبساط سے بڑھ کر (یا باہر) کام کرنا (محاورہ)

اپنی طاقت یا مقدور سے زیادہ کام کر دکھانا۔

ــبکنا اورکسی کی نہ سننا (محاورہ)

اپنی بات کہے جانا ، لگاتار بولے جانا ، دوسرے کو کچھ کہنے کا موقع نہ دینا، ضد یا ہٹ دھرمی کرنا۔

ــاپنی بلا اور کے سر دھرنا (ڈالنا یا منڈھنا یا ٹالنا)، (محاورہ)

کسی قصور یا الزام یا مصیبت سےاپنا پہلو بچانا ، کسی دوسرے کو پھنسا کرخود بری الذمہ ہو جانا

دل کو رفیق عشق میں اپنا سمجھ نہ ذوق
ٹل جائے گا یہ اپنی بلا تجھ پہ ٹال کر

۱۸۵۴ ذوق ، د ، ۱۱۱

زلف کے عشق میں بدنام مجھے کرتی ہے
آپ تو اپنی بلا اور کے سر دھرتی ہے

۱۹۲۵ شوق قدوائی (بحوالۂ نور)

ــبیتی رک : " آپ بیتی "

اپنی بیتی ہی کہا کرتی ہوں میں راتوں کو
دھیان قصے کا مجھے ہے نہ کہانی کی ہوس

۱۸۳۵ رنگین (بحوالۂ نور)

آپ نے جو کچھ کہا ہم نے سنا
اپنی بیتی ہم بھلا کس سے کہیں

۱۸۹۶ تجلیات عشق ، اکبر ، ۲۰۸

جو رو رو کر کہا میں نے تو سمجھے تم کہ شکوہ تھا
اسی کو اپنی بیتی لوگ کہتے ہیں کہانی ہیں

۱۹۱۴ نشتر ، یاس ، ۱۷

یہ سب بے نظیر اپنی بیتی کہی ہے
نہیں یہ کہانی ، فسانا کسی کا

۱۹۳۲ کلام بے نظیر ، ۲۵

ــبھوک کھانا اپنی نیند سوتا (محاورہ)

آزاد و فارغ البال ہونا

کھاتے تھے اپنی بھوک تو سوتے تھے اپنی نیند
مانا قفس میں تھے ہمیں کھٹکا تو کچھ نہ تھا

۱۹۳۲ ریاض رضواں ، ۶۶

—پڑنا (محاورہ)

۱ ۔ خطرہ لاحق ہونا ۔ خوف کھانا

زمیں کو بھی پڑی اپنی فلک کو بھی پڑی اپنی
شب غم جب مرے نالوں کو مانوس اثر دیکھا

۱۹۳۷ شعاع مہر ، ۱۹

۲ ۔ پریشانیوں میں مبتلا ہونا

کشا کش میں ہے جان عاشق زار
اسے اپنی مجھے اپنی پڑی ہے

۱۸۹۶ تجلیات عشق ، اکبر ، ۳۳۵

کون اس کی حفاؤں سے بچائے مرے دل کو
دل جس کی بغل میں ہے اسے اپنی پڑی ہے

۱۹۲۵ شوق قدوائی ، د، ۱۶۷

۳ ۔ اپنے فائدے پر نظر رکھنا ، خود غرضی کرنا

—پگڑی اپنے ہاتھ (کہاوت) رک : **"اپنی آبرو اپنے ہاتھ"**

—پیٹھ نہیں دکھائی دیتی (کہاوت)

انسان کو اپنے عیوب نظر نہیں آتے

—پیڑ پرائی باتیں (کہاوت)

انسان اپنے ہی دکھ درد کو محسوس کرتا ہے دوسرے کی تکلیف کا احساس نہیں کرتا (پیڑ = درد)

—تو خبر لو (لے لیں ، لیجیے) (محاورہ)

دوسروں پر نکتہ چینی کرنے سے پہلے اپنے حال کو دیکھ لینا چاہیے ، پہلے اپنے کو درست کرو ، پھر دوسرے پر انگلی اٹھاؤ۔

بہار آئی کیا جوش جنوں نے پیرہن ٹکڑے
خبر لیں اپنی گر ہنستے ہیں کیا میرے گریباں پر

شعور (بحوالۂ نور)

—تو یہ دیہی بھی نہیں (کہاوت)

دنیا کی ساری ملکیتیں عارضی ہیں ایک دن ان کو چھوڑنا پڑے گا۔ (دیہی = جسم)

—ٹانگ کھولے (کھولیے) اور آپ ہی لاجوں مرے (مرئیے) (کہاوت)

رک : **"اپنا گھٹنا کھولیے الخ "**

مثل مشہور ہے کہ اپنی ٹانگیں کھولیے آپ ہی لاجوں مرئیے۔

۱۸۹۶ تاریخ ہندوستان، ۲ : ۲۲

—ٹن (یا ٹنڑ) میں رہنا (محاورہ)

اکڑے تنے رہنا ، الگ تھلگ رہنا ، مغرور ہونا ، (ٹن = گھمنڈ ، غرور)

—جان پر کھیلنا (محاورہ)

جان جوکھوں کا کام کرنا ، جان گنوانے کو مستعد ہونا .

کسی نے کہا ہم اپنی جان پر کھیلنے والے تھے ،
کسی نے اپنی تباہی کی درد انگیز کہانی بیان کی۔

۱۹۰۳ خدائی فوجدار ، ۱ : ۲۴۶

نیز "جان پر کھیلنا" رک

ـــجان سے جانا (محاورہ)

ہلاک ہونا ، مرنا۔

عیادت کو جو تو آیا ، گیا میں جان سے اپنی
اگر مثل قضا عیسیٰ ہوا تیرا گزر تو کیا

۱۹۰۵ د ، انجم ، ۱۱

ـــجان کو رونا (محاورہ)

شکوے شکایتیں کرنا ، جھینکنا

جھڑ جھڑاوے ہے کان کو کوئی
روے ہے اپنی جان کو کوئی

۱۸۱۰ میر ، ک ، ۱۰۰۴

ـــجمانا (محاورہ)

اپنا اثر بٹھانے کی کوشش کرنا

اشک خوں رنگ لائے جاتا ہے
داغ اپنی جمائے جاتا ہے

۱۸۷۸ گلزار داغ ، ۱۹۰

ـــجوانی سے پائے

(کوسنا) جوانا مرگ ہو!

ـــچھاتی پر کودوں دلوانا (محاورہ)

ظلم وستم برداشت کرنا۔ (کودوں = ایک قسم کا غلہ ہے جس کا کوٹنا دشوار ہے)۔

ہوچکی ہوف تھی جو رسوائی
بندی ایسی نہیں ہے سودائی
کہ جو پھر دام میں ترے آئے
اپنی چھاتی پہ کودوں دلوائے

۱۸۸۰ بلق لکھنوی (امیر بحوالہ)

نیز "چھاتی پر کودوں دلوانا"

ـــچھاتی پر ہاتھ دھرنا (ہاتھ دھر کے دیکھنا) (محاورہ)

اپنے دل کا چور پکڑنا، اپنی صحیح کیفیت کو جاننا، خود فریبی سے بچنا

دل کی چوٹ اور تم سے صبط اے شوق
اپنی چھاتی پہ ہاتھ دھر دیکھو

۱۹۲۵ شوق قدوائی ، ۱۲۰

۲ ۔ انصاف کرنا ، خدا لگتی کہنا

غیر کو چاہو اور ہم کو نہ نظر بھر دیکھو
چھاتی پر اپنی بھی ٹک ہاتھ بھلا دھر دیکھو

۱۸۱۸ اظفری ، د ، ۲۹

ـــچھاچھ کو کوئی کھٹا نہیں بتاتا (نہیں کہتا) (کہاوت)

اپنی چیز کو سب اچھا بتاتے ہیں، اپنی چیز یا کام میں کوئی عیب نہیں نظر آتا [فارسی کی اس مثل کا ترجمہ: "کس نگوید کہ دوغ من ترش است"]

ـــخوشی (الف) فجائیہ

ہم جیسا چاہیں کریں ، کسی کو کیا

جب کہا میں نے مرے قتل میں اب دیر ہے کیوں
بولے وہ اپنی خوشی آپ کو جلدی کیا ہے

۱۸۸۸ صنم خانۂ عشق، امیر ، ۳۲۷

مستم ہے حسن کی فطرت تو ذوق اختیار اپنا
محبت اس کی یکسر غم سہی لیکن خوشی اپنی

۱۹۲۷ سہا (ق) ، ۵۳

(ب) مت
رضا و رغبت سے

لائی حیات آئے ، قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے
۱۸۵۴ ذوق ، د ، ۲۱۹

—خوشی کا صف
خودرائے ، ضدی

میاں وہ اپنی خوشی کے ہیں کسی کی بات کب مانتے ہیں -
۱۹۴۱ شمع ، ۲۲

—خیر منانا (محاورہ)
۱ - اپنا بچاؤ کرنا ، اپنی سلامتی چاہنا

خیر اپنی منا فکر ہماری تجھے کیا ہے
ظالم یہی گو ہے یہی میدان و غا ہے
۱۸۷۵ مونس ، ۲ : ۱۵۱

اب اپنی خیر منا کل تو قطعاً سولی دیا جائے گا -
۱۸۹۲ عمر و عیار کی سوانح ، ۱ : ۱۶

۲ - اپنی صلاح و فلاح یا سود و بہبود کی فکر کرنا

اگر کوئی شخص بلا قومی بھلائی کے صرف اپنی ہی خیر منانی چاہے تو اس کی کبھی خیر نہ ہوگی -
۱۸۹۸ مجموعۂ لکچرز ، نذیراحمد ، ۸۷

۳ - (مجازاً) خود غرضی کرنا ، مطلب آشنا ہونا -

—ڈفلی اپنا راگ (کہاوت) رک : اپنی اپنی ڈفلی الخ جو فصیح ہے

اپنی ڈفلی اپنا راگ
اس پر مل کر ڈالو آگ
۱۹۲۶ اودھ پنچ ، ۱۱ : ۴۰۱

اپنی ڈفلی اپنا راگ اپنی دوڑے اپنی بھاگ
کہنے میں بات آتی ہے سردار نہیں تو کچھ بھی نہیں
۱۹۵۷ گنجینہ ، ۵۴

—ڈیڑھ اینٹ کی (مسجد) الگ (جدی) چننا (چنوانا ، بنانا) (کہاوت)
۱ - دوسروں سے بےنیاز ہوکر اپنا مختصرسا ٹھاٹھ قائم کرنا ، سب سے الگ تھلگ رہنا

اپنی ڈیڑھ اینٹ کی جدی مسجد
کسی ویرانے میں بنائیے گا
۱۸۱۰ میر ، ک ، ۱۲۶

قدرت کے انتظام میں رد و بدل کر، اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ چن لو -
۱۹۰۸ صبح زندگی ، ۲۲۵

۲ - گروہ سے انحراف کرنا ، مسلمہ روش سے روگردانی کرنا

۳ - خود رائی کرنا

جب میں بیاہ کر آئی ہوں تمہاری عمر خاصی بارہ برس کی تھی ، کبھی میں نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ چنوائی؟
۱۹۴۱ شمع ، ۴۸

—ذات سے مت بذات خود ، اپنے آپ

انجمن کیسی تم اپنی ذات سے ہو انجمن
گوشۂ خلوت میں بھی بیٹھو تو اک محفل بنو
۱۹۲۰ انجم کدہ ، ۱۸

ــــران کھولنا(کنایہ)

۱ ۔ اپنا پوشیدہ عیب بیان کرنا

۲ ۔ آپ اپنوں کی برائی کرنا

ــــراہ پکڑنا (محاورہ) ۔ رک : اپنی راہ لینا

ــــراہ لگنا (محاورہ)

۱ ۔ چل دینا، روانہ ہونا م: یہاں کیسے کھڑا ہے اپنی راہ لگ.

۲ ۔ اپنے کام سے کام رکھنا ، دوسرے سے سروکار نہ رکھنا

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

۱۸۱۸ انشا ، ک ، ۹۶

ــــراہ لینا (محاورہ)

۱ ۔ رک : اپنی راہ لگنا

میرا سر کاٹ لے میں حاتم ہوں اور اپنی راہ لے ۔

۱۸۰۲ گنج خوبی ، میرامن ، ۹۴

اگر ہوسکے تو اس سودائے خام کو چھوڑو اور اپنی راہ لو ۔

۱۸۹۳ نشتر ، ۲۷

۲ ۔ اپنی منزل کی طرف جانا، اپنے رستے پر چلنا

خدا کو مان اپنی راہ لے کعبے کو جا مومن
صنم خانے میں کیا لیوے گا اے گم گشتہ رہ رہ کر

۱۸۵۱ مومن ، ک، ۶۲

اب ہم اپنی راہ جائیں اور تو اپنی راہ لے

۱۹۱۰ جذبات نادر ، ۵۷

ــــسدھ نہ آنا (رہنا) (محاورہ)

بے خبری کے عالم میں ہونا، اپنے آپے کا ہوش نہ رہنا

کیا رات دن کٹے ہیں ہجراں کی بے خودی میں
سُدھ اپنی میر اس بن دو دو پہر نہ آئی

۱۸۱۰ میر ، ک ، ۸۲۷

ــــسی (الف) مف

۱ ۔ مقدور بھر ، بقدر وسعت، تابہ امکان

غرض اپنی سی وہ تو کر گذرا
ہوگئی رات ایک مینہہ نہ کھلا

۱۷۸۰ سودا ک، ا ۳۸۲

اپنی سی تو سوچتے ہیں سب کچھ
آتا نہیں دھیان میں یہ اب کچھ

۱۸۵۱ مومن ، ک ، ۲۳۷

پیغمبر صاحب نے اپنی سی بہتیری کی کہ ان کی نسبت ایسے خیالات نہ کیے جائیں.

۱۸۹۹ رویائے صادقہ ، ۱۴۹

یارو یہ ہچر مچر کہاں تک
اپنی سی کرو بنے جہاں تک

۱۹۱۱ ک ، اسمٰعیل میرٹھی ، ۴۹

۲ ۔ حسب دلخواہ، اپنی مرضی کے مطابق، اپنے مطلب کی

اگر بد ہے تو لاکھ پردے میں رکھو وہ اپنی ہی سی کر جائے گی ۔

۱۸۸۰ فسانہ آزاد ، ۲ : ۷۰

تم اپنی سی کہتے تھے جو کہہ چکے سب
نہیں ناصحو تم پہ الزام اب کچھ

۱۸۹۳ د ، حالی ، ۱۰۶

نہ کھل سکا تری باتوں کا ایک سے مطلب
مگر سمجھنے کو اپنی سی ہر بشر سمجھا
۱۹۳۸ میخانۂ الہام ، ۵۹

(ب) صف - اپنی جیسی، اپنی ایسی ("اپنا سا" کی تانیث)

ہم دمو سب کی طبیعت ہو اگر اپنی سی
تو کہیے ہم ہے نہ ہر اک بشر اپنی سی
۱۸۴۵ ک ، ظفر ، ۱ : ۳۷۶

یوں نہ ہم جسموں سے کرتی تھیں یہ آنکھیں چوریاں
تو نے اپنی سی سکھا دیں ہم کو تنہا خوریاں
۱۹۰۵ کلیات نظم حالی، ۲: ۵۰

ـــسی صورت لے کر رہ جانا

رک "اپنا سا منہ لے کر رہ جانا"
پھر چلا آیا ترا شوق زیارت لےکر
مثل موسیٰ نہ رہا اپنی سی صورت لےکر
۱۹۰۶ تیر و نشتر ، ۲۴

ـــسی کرنا (محاورہ)

۱ - مقدور بھر کوشش کرنا

اب تو وہ جانے کی نہیں بیٹھی ہے بن کے ماچھ توڑ
اپنی سی میں تو کر چکا صاف کہوں ہوں منہ کر پھوڑ
۱۸۱۸ انشا ، ک ، ۳۸۵

ہم نے اپنی سی بہت کی بخدا اے عاشق
۱۸۶۸ شعلۂ جوالہ ۲: ۷۶۲

نا خدا اپنی سی کر گذرا مگر مجبور تھا
کھینچ لایا پھر در مقصود ساحل سے مجھے
۱۹۲۷ آیات وجدانی، ۲۶۰

۲ - اپنی افتاد رائے کے موافق عمل کرنا، اپنی خواہش کے مطابق کرنا

اگر بد ہے تو لاکھ پردے میں رکھو وہ اپنی ہی سی کر جائے گی۔
۱۸۸۰ فسانۂ آزاد ، ۲: ۷۰

ـــسی کہنا (محاورہ)

۱ - اپنے مطلب کی بات کرنا، اپنے دل کی کہنا

تم اپنی سی کہتے تھے جو کہہ چکے سب
نہیں ناصحو تم پہ الزام اب کچھ
۱۸۹۳ د ، حالی، ۱۰۶

یہ دنیا ہے اے شاد ناحق نہ الجھو
ہر اک کچھ تو اپنی سی آخر کہے گا
۱۹۳۸ میخانۂ الہام، ۴۹

ـــسی گانا رک : "اپنی سی کہنا"

چپ رہو اے مطربو کھٹراگ ہے فرقت میں راگ
کچھ تو میری بھی سنو اپنی سی گانا کیا ضرور
۱۸۸۱ اسیر ، د ، ۱۴۷

گل ستے ہیں کب صدائے بلبل
اپنی سی ہزار گائے بلبل
۱۸۸۸ صنم خانۂ عشق، ۱۱۵

ـــصورت (تو) دیکھو (محاورہ)

تم ہرگز اس قابل نہیں (جب کوئی اپنی حیثیت یا قدرت سے بڑھ کر دعوئی کرے)

کچھ ہم سے بڑھ کر ہو ذری آئینے میں اپنی صورت تو دیکھو۔
۱۸۸۰ فسانۂ آزاد ، ۳ : ۲۲۵

ــطرف دیکھنا (محاورہ)

۱ ۔ اپنے مرتبے اور درجے کا لحاظ کرنا

۲۔ دوسرے کے عیب یا قصور سے چشم پوشی کرنا

آئینہ ٹوٹ گیا مجھ سے تو کیا قہر ہوا
دیکھو تم اپنی طرف آؤ ادھر جانے دو

۱۸۶۷ رشک ، د ، ۲۴۲

۳ ۔ (لفظاً) اپنی حالت کا جائزہ لینا ، اپنے حال پر نظر رکھنا، خود کو سنبھالنا

مہو شو اپنی طرف دیکھو قیامت کیا ہے
اتنی گرمی نہ کرو مہر نہ جل جائے کہیں

۱۸۷۰ الماس درخشاں ، مہر ، ۱۳۴

ــطرف سے مت

۱ ۔ اپنے ذہن سے گھڑ کر، اپنے دل سے جوڑ کر

یہ ایسا خائن ترجمان ہے کہ اپنی طرف سے نمک مرچ لگا کر بات کا بتنگڑ بنا دیتا ہے۔

۱۹۰۶ المعترف والعرائس ، ۳ ۰ ۵۵

۲ ۔ ازخود، ذاتی رائے یا تدبیر سے، م: اپنی طرف سے بلاوا دے دیا

۳ ۔ اپنی چاہت سے، ذاتی طور سے م: اپنی طرف سے کوئی کلمۂ خیر نہ کہا

۴ ۔ اپنی جانب سے ، م: صدر نے ایک انعام اپنی طرف سے بھی دیا

ــعزت اپنے ہاتھ (کہاوت) رک: **" اپنی آبرو اپنے ہاتھ "**

اس کی احتیاط نہایت درست اور بجا تھی کہ اپنی عزت اپنے ہاتھ ہے، کیوں ایک کہیں اور دو سنیں۔

۱۹۰۸ صبح زندگی ، ۲۳

ــغرض باولی (کہاوت)

غرض کے پیچھے آدمی پاگل بن جاتا ہے ، غرض مندی آدمی کو ہر بات پر مجبور کر دیتی ہے

اپنی غرض باولی ، اس ظلم و ستم پر بھی مصیبت ماریاں کوسوں سے آئیں۔

۱۹۰۸ صبح زندگی ، ۲۰۱

ــغرض کا آشنا (یار) صف **خود غرض، مطلبی**

خودرو جتنے زمانے میں ہیں سب عیار ہیں
آشنا اپنی غرض کے ہیں یہ کس کے یار ہیں

۱۸۵۷ رند ، د ، ۱ : ۱۰۸

آشنا ہیں جتنے ہیں اپنی غرض کے آشنا
خوب دیکھا ہم نے اپنا آشنا کوئی نہیں

۱۸۵۶ ؟ ک، ظفر، ۴ : ۹۴

ــقبر کھودنا رک: **" اپنے ہاتھوں (سے) اپنی قبر کھودنا "**

ــقسمت (تقدیر) کو رونا (محاورہ)

۱ ۔ اپنی بے نصیبی کی شکایت کرنا ، اپنی بدقسمتی پر اظہار افسوس کرنا

کچھ مجھ کو گلہ نہیں کسی سے
اپنی قسمت کو رو رہا ہوں

۱۸۵۲ مسرور (بحوالۂ نور)

۲ ۔ مجبوری و بے بسی کی حالت میں بسر کرنا ، مصیبت کو جھیلنا ، م: گزارا کیسا ، اپنی قسمت کو روتا ہے سو رو رہے ہیں ۔

۳ ۔ کام کرنے میں رو دینا ، مر مر کے کام کرنا ، م: پہر بھر سے اپنی قسمت کو رو رہا ہے اور ایک کام بھی نہیں نمٹا ۔

—کرنا رک : " اپنی سی کرنا " (۲)

فراق یار میں تاب و تواں رہے نہ رہے
کروں گا اپنی ہی گو تن میں جاں رہے نہ رہے

۱۸۵۷ رند ، د ، ۱ : ۲۲۵

سو برس کے بعد موقع ہو تو میں اپنی کروں ۔

۱۹۱۴ طلسم ہوش ربا ، ۷ : ۴۹

—کرنی مث

۱ ۔ اپنے کرتوت ، اپنی حرکت

۲ ۔ اپنی ہٹ ، اپنی مرضی کا کام

—کرنی اپنی بھرنی (کہاوت) رک : " اپنا کرنا اپنا بھرنا "

اپنی کرنی اپنی بھرنی ، تم بڑی خدا ترس ہو ، کھڑی جنت میں جاؤ گی ۔

۱۹۲۰ بزم آخر ، ٦٦

—کرنی اپنے ساتھ (کہاوت) رک : " اپنی کرنی اپنی بھرنی "

—کرنی پار اترنی (کہاوت) (پورب)

اپنا کیا کام آتا ہے ، اپنے اعمال نجات کا باعث بنتے ہیں

—کرنی کر گذرنا رک : " اپنی کرنی کرنا "

ایسا نہ ہو کہ مین اپنی جگہ سوچتی کی سوچتی ہی رہوں اور یہ لوگ اپنی کرنی کر گذریں ۔

۱۸۹۱ ایامیٰ ، ۲۳

—کرنی کرنا (محاورہ) اپنی خواہش یا غرض یا مقصد کو پورا کرنا

تو اندھیرے کو نور کرتا ہے اپنی کرنی ضرور کرتا ہے

۱۹۱۳ نذر خدا ، ۱۲۵

۲ ۔ اپنی حرکتوں سے باز نہ آنا

لوگ دکھ درد بھرتے جاتے ہیں
اپنی کرنی وہ کرتے جاتے ہیں

۱۸۷۸ یادگار داغ ، ۲۰

—کملی میں مست ہونا (محاورہ) قانع ہونا ، تھوڑی حیثیت میں بھی خوش و خرم رہنا

—کو بوں پرائی کو ووں (کہاوت) (بولتے وقت پہلے فقرے پر دونوں انگوٹھے اٹھاتے اور دوسرے فقرے پر پٹ کر دیتے ہیں) مثلاً اپنی چیز کو بڑھاتے دوسرے کی چیز کو گراتے ہو ۔ اپنی چیز کے زیادہ دام لگاتے ہو اور دوسرے کی چیز کے کم ۔

—کھال میں مست ہونا (محاورہ) رک : " اپنی کملی میں مست ہونا "

—کہی کرنا (محاورہ) کسی کی صلاح مشورے کو نہ ماننا ، اپنی ضد پر اڑے رہنا

— کھچڑی الگ پکانا

صلح و صفائی کے ساتھ الگ ہوجانا ، جھنجھٹ سے بچنا

میرے لئے اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہیں کہ اپنی کھچڑی الگ پکاؤں۔

۱۹۱۸ بازار حسن ، ۲۷۹

— گانا

۱ ۔ (دوسرے سے بے نیاز ہوکر) اپنی باتیں کرنا ، اپنی داستان سنانا

۲ ۔ (مجازاً) دوسرے سے بے نیاز ہونا ، دوسرے کی باتوں کی طرف التفات نہ کرنا

ہم نے کیا کیا نہ شب وصل صنم سر پٹکا
اپنی گایا کئے نوبت کے بجانے والے

۱۸۹۳ معیار نظم ، اشک ، ۲۹۰

— گرہ کا صف

۱ ۔ ذاتی جمع جتھا ، اپنی پونجی ، اپنا کمایا ہوا

۲ ۔ ذاتی ، نج کا ، اپنا

بعض کو اپنی گرہ کی عقل نہیں ہوتی، جس طرف لوگوں کو دوڑتے دیکھا آپ بھی دوڑنے لگتے ہیں ۔

۱۸۸۰ آب حیات ، ۳۵۷

— گرہ سے مف

اپنی جیب سے ، اپنے پاس سے ، اپنے مال میں سے

— گڑیا سنوار دینا (محاورہ)

بیٹی کو حسب حیثیت دان جہیز دے کر بیاہ دینا، معمولی حیثیت کے آدمی کا بیٹی کے فرض سے سبکدوش ہونا

— گلی میں کتا بھی شیر ہوتا ہے (کہاوت)

اپنے علاقے میں ہر شخص کی جرات و ہمت بڑھ جاتی ہے، بزدل بھی حمایتی کے بھروسے پر بہادر ہو جاتا ہے۔ ایسے شخص کے لئے بولتے ہیں جو دوسرے کی حمایت کے بل پر دھمکائے یا اینٹھے (دریائے لطافت)

گھر میں رقیب کیوں نہ جتاوے سپہ گری
اپنی گلی میں کہتے ہیں کتا بھی شیر ہے

۱۸۸۶ مہر حسن ، د ، ۱۱۹

اپنی گلی میں کتا بھی شیر ہوتا ہے، ہم بھی دیکھیں گے کہ آدمی کے بچوں کے پالنے پر بھیڑیوں کا غول کیا کہتا ہے۔

۱۹۰۱ جنگل میں منگل، ۲۱

بنتا نہیں شیر اگرچہ کہنے کے لیے
ہوتا ہے گلی میں اپنی کتا بھی شیر

۱۹۲۰ احسن ، منظوم کہاوتیں، ۲۰

— گوں کا صف

۱ ۔ غرض و مطلب کے مطابق ، اپنے کام کا یا ڈھب کا

۲ ۔ خود غرض، مطلب آشنا

یار تم کو دل نہیں دینے کا بے بوسہ لیے
تم جو اپنی گوں کے ہو میں بھی ہوں اپنی گھات کا

۱۸۳۶ ریاض البحر ، ۷

تم اگر اپنی گوں کے ہو معشوق
اپنے مطلب کے یار ہم بھی ہیں
۱۸۹۲ مہتاب داغ ، ۱۳۸

—گوں کا یار رک : **"اپنی گوں کا" (۲)**

اے دل اس سے حاصل مطلب بہت دشوار ہے
غیر ہے ، نا آشنا ہے ، اپنی گوں کا یار ہے
نکہت ، (بحوالۂ امیر)

یار اپنی ہی گوں کے ایک عیار
حیّالہ و دلفریب و مکار
۱۸۵۱ مومن ، ک ، ۲۸۵

—گوں کو مث

اپنی مطلب کی خاطر ، اپنی غرض سے

بھول بھولا تمہیں کہا ہے آپ
اپنی گوں کو بڑے سیانے ہیں
۱۸۱۸ اطفری ، د ، ۳۱

—گوں گانٹھنا (محاورہ)

مطلب نکالنا ، مقصد حاصل کرنا

اپنی گوں گانٹھتے ہیں ہم بھی میر
نکلا مطلب تو پھر ہے مطلب کیا
۱۸۱۰ میر ، (بحوالۂ نور)

—لگنا رک : **"اپنی پڑنا"**

تو جسے دیکھتی تھی اس کو لگی تھی اپنی
پڑگئی تھی عرض اک ایک کو اپنی اپنی
۱۸۹۷ نظم آزاد ، ۸۰

—لینا (محاورہ)

من مانی کرنا ، تغافل برتنا

اس پر بھی جو تو اپنی لیے جائے تو خیر اب
اس پر بھی جو تو غصہ پیے جائے تو خیر اب
۱۸۸۵ دیوان سخن ، ۲۶۰

—مانی منوانا (محاورہ)

اپنی بات دوسرے سے منوانا ، مخاطب کو قائل کرنا

اچھا بولنے والا اپنی مانی منوا لیتا ہے اور بڑےبڑے قابل منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں ۔
۱۹۲۸ ذاکر علی ، باتوں کی باتیں ، ۷

—مراد کو پہنچنا (محاورہ) ۱ - اپنے مقصد میں کامیاب ہونا ، کامیاب ہونا

۲ - (پھل) پختہ ہونا (نور)

— من جگت کی ہنسی (کہاوت)

اپنا نقصان اور دوسروں کے لئے خوشی کا سامان

ق: **نقصان مایہ شماتت ہمسایہ**

— من کو مرنا (محاورہ)

۱ - آبرو کے لئے برداشت کرنا

۲ - اپنے قول کی خاطر نقصان اٹھانا

— موت مرنا فل

طبعی موت واقع ہونا ، مبتلائے مرض ہو کر جان دینا

بیداد گر کو رہ گئی کیا حسرت ستم
جب اپنی موت کوئی دل افگار مرگیا

۱۸۸۴ آفتاب داغ ، ۲۲

مرا دشمن خود اپنی موت، تو نے تو نہیں مارا
کوئی مرد عمل جھوٹی خوشی پر شاد ماں کیوں ہو

۱۹۵۷ گنجینہ ، ۵۸

ــ ناک چوٹی (میں) گرفتار ہونا (محاورہ)

۱ ۔ خود آرائی کرنا، بناؤ سنگھار میں لگے رہنا

ہے آئینے میں اپنا محو دیدار آپ ہی اب تو
وہ اپنی ناک چوٹی ہے گرفتار آپ ہی اب تو

۱۹۲۵ شوق قدوائی ، د، ۱۱۲

۲ ۔ اپنے کاموں میں اتنا مصروف ہونا کہ کسی دوسرے کے کام کی فرصت نہ ہو۔

ــ ناک کٹی تو کٹی پرائی بدشگونی تو ہوگئی (کہاوت) اپنی رسوائی ہوئی تو کیا، دشمن کو تو اذیت پہنچ گئی ، (طنزاً ، جب کہ کوئی بے وقوفی سے دوسروں کی جلن میں اپنا ہی نقصان کر بیٹھے)

ــ نبیڑنا مل

اپنی فکر کرنا ، اپنی مشکلات سے نبٹنا ، اپنی دھن میں رہنا

رند خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو
تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

۱۸۵۴ ذوق ، د، ۱۵۲

ــ نظر میں آپ نظر آنا (محاورہ)

صفر رہ جانا، مٹ جانا

فلورا کے چلے جانے سے میری یہ حالت ہوگئی کہ میں اپنی نظر میں آپ نظر آتا ہوں۔

۱۹۲۶ شرر ، فلورا فلورنڈا ، ۳۹۸

ــ نظروں کے دیکھتے مف

ہمارے سامنے ، دیکھتے ہی دیکھتے

روئیے اس غم کدے میں آج کس کس کو کہ یاں
دیکھتے نظروں کے اپنی اک جدائی کیا ہوئی

۱۷۹۳ قائم، د، ۱۳۶

ــ نوبت بجانا (محاورہ) اپنی باری بھرنا ، عمر بسر کرنا، وقت گزارنا

ہر کوئی اس مقام میں دس روز
اپنی نوبت بجائے جاتا ہے

۱۸۱۰ میر ، ک ، ۵۲۶

ــ نیند سونا اپنی بھوک کھانا

رک: **"اپنی بھوک کھانا، اپنی نیند سونا"**

عشق سے توبہ کرلی اب اس ظالم سے بے پروا ہوں
اپنی نیند میں سوتا ہوں اور اپنی بھوک میں کھاتا ہوں

۱۹۲۵ شوق قدوائی ، د، ۹۷

ــ نیند سونا اپنی نیند جاگنا (کہاوت)

رک: **"اپنی نیند سونا اپنی بھوک کھانا"**

وہ رزاق ہے، کہیں اور مزدوری کریں گے، اپنی نیند سوئیں گے اپنی نیند جاگیں گے۔

؟ آستین کا سانپ ، ۷۶

ـــوادی پر آنا

رک: **"اپنی والی پر آنا"**

جو پُو اپنی وادی پر آتا ہے تو سبھ علم اس میں سماتا ہے۔

۱۶۲۲ سبھ رس ، ۱۲۰

پھر وہی شوق دشت جوش جنوں اپنی وادی پہ آگیا گردوں

۱۸۵۱ مومن ، ک ، ۲۵۲

ـــوالی امث

۱ ۔ ضد ، ہٹ

۲ ۔ فطری تقاضا ، ذاتی جلال

مگر میں اپنی والی سے نہیں چوکتا۔

۱۹۱۵ سجاد حسین ، طرحدار لونڈی ، ۲۱

۳ ۔ اپنی سی پوری کوشش ، مقدور بھر جد و جہد

روپیہ پانی کی طرح بہادیا ، شفا ہونا نہ ہونا تو خدا کے اختیار ہے۔ باقی اپنی والی تو سبھ کر گزرے۔

۱۹۲۵ اودھ پنچ ، ۱۰ ، ۶ : ۱۰

ـــوالی (والیوں) پر آنا (لڑنا) (محاورہ)

۱ ۔ (کسی بات پر) اڑجانا ، ہٹ کرنا

اور جو میں اپنی والی پر آجاتی تو یہ جو گفتگو شروع کردیتی تو کیا رہ جاتی۔

۱۹۰۵ کایا پلٹ ، ۱۱۲

۲ ۔ ذاتی جلال و غضب سے کام لینا ، فطری تقاضے کے مطابق کام کرنا

اگر ہم کبھی اپنی والی پر آئیں
تمہارے فلک کو نہ خاطر میں لائیں

۱۷۸۹ مہر حسن ، ۱۳۴

جس وقت وہ اپنی والی پر آئیں تو پھر الٹی لے جائیں نہ سیدھی لے جائیں۔

۱۹۱۱ قصۂ مہر افروز ، ۳۵

اپنی والی پر آؤں تو دم بھر ٹھہرنا دشوار کردوں۔

۱۹۰۵ کایا پلٹ ، ۷۵

۳ ۔ اپنی سی کرنا

یہ سن کے اس نے مانگ کے تقدیر سے مدد
پھر اپنی والیوں پہ جو کچھ آگیا نصیب

۱۸۲۶ صنعت ، ک ، ۱۷

۴ ۔ اپنی اصالت پر جانا ، اوچھی حرکتیں کرنا

موج وحشی کا دل لہرایا ، اپنی والیوں پر اترا ، بدافعالیوں پر اترا۔

۱۹۰۱ راقم ، عقد ثریا ، ۱۰۱

ـــہانکنا (محاورہ)

رک: **"اپنی بکنا"**

ـــہالی اور پرچھالی (ڈھالی یا گنوالی) (کہاوت)

اپنا قصور دوسرے کے سر منڈھنا ، اپنی برائی اور پہ تھوپنا

آپ کی تو یہ مثل ہے کہ اپنی ہالی اور پر گرالی۔

۱۸۸۲ طلسم ہوش ربا ، ۱ : ۱۹۷

سچ ہے اپنی جان ... پر گوائی جیسے تم میاں
کی محبت میں خدا اور رسول سب کو بھول گئیں، ویسا
سب کو جانتی ہو۔

۱۹۰۰ شریف زادہ، ۹۱

ہاں صاحب اپنی ہاں اور پر گوائی،
خیر خوش رہو میاں تم تو سپنے چھوٹے۔

۱۹۲۸ اودھ پنچ، ۱۳، ۲۸ : ۵

ـــهالی جانے والی (کہاوت)

تکلیف کا احساس اسی کو ہوتا ہے جو اس سے واقف ہو، دوسرا کیا جانے۔ ف: جس کی پھٹی نہ ہو بوائی وہ کیا جانے پیڑ پرائی

اَپنے (ف ا، سکن پ، ی مج بہ کس) **آپنے (قدیم)**

(الف) ضمیر اضافہ

۱. اپنا کی جمع

اپنوں کون اپنے کرنا اپنوں کی حال دریغ ددھرنا۔

۱۶۲۲ سب رس، ۱۲۰

پہلے اپنے مکانوں میں بیٹھ کر محروم دیکھنے لگے۔

۱۸۰۵ سنگھاسن بتیسی، ۹۰

۲. اپنا کی مغیرہ یا ظرفی حالت

وهیں دت سن شاہ کی گن ددھاں
کتاباں پڑیوں آپنے ہی کہوں

۱۶۵۷ گلشن عشق، ۹۲

جو اپنے جی کی بات ہے سو کہتے کیوں نہیں۔

۱۸۰۲ رانی کیتکی، ۱۲

بلاں ہے گر مطلو۔ دے گھر کا پتہ اپنے
ٹھہر س کے سمجھے تمہارا مکان معلوم کیا ہوگا
؟

۱۸۵۶ د، ظفر، ۲ : ۳

اپنے سہارے نہ بیٹھو۔

۱۸۸۰ مہر کہسار، ۱ : ۲۲

(ب) ضمیر فاعلی۔ خود یا آپ کے معنی میں (بطور تاکید)

واں تم تو اپنے ہوش سے ہوگے کہ (ہے؟) کیا کہوں
گزرا ہے میرے جی پہ جو یاں کچھ عذاب رات

۱۷۸۵ درد، ۵، ۲۸

تجھ سے صحبت ہے سو کیونکہ سمجھے
میں تو اپنے غریب تو ووش

۱۷۹۲ قائم، ۹۷

ان سے کہہ دو جہاں جی چاہے اپنے پڑے رہیں۔

۱۸۰۲ رانی کیتکی، ۹

ہم تم کو اتنا دے سکتے ہیں کہ اپنے چھوٹا موٹا کوئی کاروبار کر سکو۔

۱۹۱۵ سجاد حسین، دھوکا، ۱۲۰

(ج) امذ۔ بیگانے ' عزیز اقارب

رک: **اپنا (ب)**

اپنے سو اپنے پرائے سو پرائے۔

۱۶۲۲ سب رس، ۱۲۰

چہلم میں سب اپنے بیگانے، چھوٹے بڑے جمع ہوئے۔

۱۸۰۲ باغ و بہار، ۲۰

اپنے ہیں دور پاس کسی کا مکاں نہیں
جنگل ہے کوئی پوچھنے والا یہاں نہیں

۱۹۲۴ براہیں عجم، ۱ : ۹۷

[آر اپن + ے (علامت جمع یا اعراب غیر فاعلی)]

ـــاپنے رک: **"اپنا پنا" جس کی یہ جمع ہے یا حالت محرف**

فصل گل ہے مست ہیں سب اپنے اپنے حال میں

۱۸۷۴ بیخود (ہادی علی) ، ۸۲

اپنے اپنے طور پر سب ہی نے سمجھایا ۔

۱۹۳۶ گرداب حیات ، ۳۸

ـــآپے (ی مج) رک: **"اپنے آپ"**

انو بھی نماز کرتے اپنے آپے

۱۴۲۱ بندہ نواز ، معراج العاشقین ، ۲۸

ـــاختیار میں ہونا (محاورہ)

۱ ۔ طبیعت پر قابو پانا ، ہوش و حواس ہونا

بس دیکھ کے اس گھڑی کا عالم

اپنے نہ تھے اختیار میں ہم

۱۸۵۱ مومن ، ک، ۸۲۶

۲ ۔ اپنی مرضی کا مختار ہونا، آزاد ہونا

ہوتے گر اپنے اختیار میں ہم

بے بلائے ہم آپ سے آتے

(بحوالۂ مہذب)

ـــاڑھائی چاول الگ گلانا (محاورہ)

رک. **"اپنے ڈھائی چاول الگ گلانا"**

اس ساحرہ نے کہا نگوڑے الگ جا تو نہ اپنے اڑھائی چاول گلا ۔

۱۸۹۱ طلسم ہوش ربا ، ۵ : ۳۱۵

ـــاللہ سے پانا (محاورہ)

(عو) **سزا بھگتنا ، (نتیجے کے طور پر) غضب الہٰی میں مبتلا ہونا**

مجھ پہ تہمت جو لگائے سوکن

اپنے اللہ سے پائے سوکن

۱۸۹۷ جان صاحب ، (بحوالۂ امیر)

ـــاوپر لینا (محاورہ)

۱ ۔ اپنے ذمے کرنا ، متحمل ہونا، جھیلنا

اس واسطے میں نے کمر سعی کی باندھی اور اس قدر مصیبت اپنے اوپر لی ہے ۔

۱۸۰۱ آرائش محفل، حیدری، ۳۰

۲ ۔ ہدف یا سپر بن جانا ، وار کو اپنے اوپر یا الزام کو اپنے سر لینا

ـــاوپر اوڑھ لینا (محاورہ)

خود مصداق بن جانا ، اپنے پر چسپاں کر لینا ، قصور یا الزام کو اپنے سر لینا

ـــآپ (الف) ضمیر رک: **"اپنا آپا"**

اپنے آپ میں تو سکت نہیں ۔

۱۸۰۳ رانی کیتکی ، ۱۴

ہمیشہ اسے سمجھایا کہ حتی الامکان اپنے آپ کو بچاتی رہے ۔

۱۹۲۶ شرر ، فلپانا، ۱۷۵

اپنے اپ مع دیگر عورات رنواس کے جو نہر کرلیتی ہے ۔

۱۹۳۹ افسانۂ پدمنی ، ۲۰

(ب) مف

۱ ۔ خود بخود ، از خود ، اپنی فطرت یا ذات سے م: یہ مشین اپنے آپ چلتی ہے ۔

۲ ۔ بے بلائے، بلاترغیب م: میں نے کب بلایا اپنے آپ چلا آیا ۔

۳ ۔ تنہا، بغیر کسی کی مدد کے

اخلاق محسنی کا ترجمہ لے کر بیٹھا کرو اور اپنے آپ دیکھا کرو ۔

۱۸۷۴ مجالس النسا ، ۲۰

۴ ۔ جان بوجھ کر ، دانستہ م: اپنے آپ کون کنویں میں گرتا ہے ۔

۵ ۔ لازماً ، البتہ م: جو اندھوں کی طرح چلے گا اپنے آپ گرے گا ۔

۶ ۔ دل ہی دل میں، خود کلامی کے طور پر

آپ اپنے آپ کچھ شکایت آمیز باتیں بھی کر رہے تھے ۔

۱۹۱۲ راج دلاری ، ۱۶

اپنے آپ اس طرح باتیں بھی کرتا جاتا ہے ۔

۱۹۵۹ وہمی ، ۱۶

ــ آپ کو کچھ سمجھنا (محاورہ)

۱ ۔ اپنی نسبت بڑائی کے خیالات رکھنا ، اپنے تئیں بڑا لائق تصور کرنا

۲ ۔ نازاں اور مغرور ہونا

ــ آپ کو کھینچنا (محاورہ)

۱ ۔ غرور کرنا ، اکڑنا

نازک بہت ہے رشتۂ الفت نہ ٹوٹ جائے
اتنا نہ اپنے آپ کو اے معجمال کھینچ

۱۸۷۸ گلزار داغ ، ۸۱

۲ ۔ صحبت سے کترانا ، (کسی سے) اجتناب کرنا

وہ خود بھی اپنے آپ کو کھینچتی ہے ، تمام صحبتوں کو چھوڑ دیا ہے ۔

۱۹۲۶ شرر ، مقدس نازنین ، ۲۹۸

ــ آپ میں رک: **"اپنے آپے میں"**

صاحبو اس کو سودا ہوگیا ہے ، یہ تو اپنے آپ میں نہیں ہے ۔

۱۹۰۰ طلسم خیال سکندری ، ۲ : ۳۰

ــ آپ میں آنا ہوش میں آنا، حواس میں ہونا

وارفتگی شوق میں لذت یہی ہے گر
بیخود سے اپنے آپ میں آیا نہ جائے گا

۱۹۲۰ بیخود، موہانی ، ک ، ۲۴

ــ آپے سے گزرنا (محاورہ)

۱ ۔ خوشی یا بڑائی کے احساس سے مست ہوجانا، جامے سے باہر ہونا، حداعتدال سے بڑھنا

شادمانی میں گزرتے اپنے آپے سے نہیں
غم میں رہتے ہیں شگفتہ شادمانوں کی طرح

۱۸۹۳ د ، حالی ، ۵۷

جب سماتا ہے ترا اس میں غرور
اپنے آپے سے گزر جاتا ہے داغ

۱۹۰۵ داغ ، محاورات داغ ، ۱۵

۲ ۔ بیخود ہونا، اپنی ہستی کو بھول جانا

ہوش میں جب آسماں آتے ہیں ہم
اپنے آپے سے گزر جاتے ہیں ہم

۱۹۰۵ دیوان انجم ، ۸۸

ــ آپے سے نکل جانا (محاورہ) رک: **"اپنے آپے**

سے گزر جانا" (۲)

جب نکلنے نہیں دیتے ہیں مجھے زنداں سے
اپنے آپے سے میں ناچار نکل جاتا ہوں

۱۸۷۰ الماس درخشاں، مہر، ۱۵۲

—آپے میں مف۔ ہوش میں، باحواس

میں اپنے آپے ہی میں نہ تھا تو میری حالت کیا پوچھتے ہو۔

۱۹۲۴ حاجی بابا، ۲۱۶

میں عشق کی بدولت اپنے آپے میں نہ تھا۔

۱۹۲۸ اودھ پنچ، ۱۳ : ۷، ۱۰

—آگے مف۔ ۱۔ اپنے مقابلے میں

عشق کے باعث گنے جاتے ہیں نادانوں میں ہم
ورنہ گنتے اپنے آگے کس کو دانائی میں تھے

۱۸۲۹ ک، ظفر، ۲ : ۱۷۹

۲۔ آئندہ، مستقبل میں رک: "اپنے گے پائے"

—آگے پائے (عو) رک: "اپنے اللہ سے پائے"

تو نہ مانے بھاڑ میں جائے خدا کرے اپنے آگے پائے۔

۱۹۰۱ راقم، عقد ثریا، ۶۸

—باپ کا (بیٹا) ہے (کہاوت) ۱۔ اپنے باپ کی سیرت یا خصائل و شمائل کا حامل ہے
۲۔ اپنے باپ کے نقش قدم پر چل رہا ہے، وہی کر رہا ہے جو اس کا باپ کرتا تھا

—باپ کا نہیں (محاورہ)
۱۔ کسی کی رو رعایت نہیں کرتا
۲۔ شرم و حیا سے عاری ہے

—باولوں روئیے دوسرے کے باولوں ہنسیے (کہاوت)
دنیا کے لوگ اپنے نقصان کا افسوس کرتے اور دوسرے کے نقصان کی ہنسی اڑاتے ہیں۔

—بچے کو ایسا ماروں جو پڑوسن کی چھاتی پھٹے (کہاوت) خود کو ایسی تکلیف پہنچاؤں کہ حریف بھی دیکھنے کی تاب نہ لاسکے

—بچھڑے کے دانت سب کو معلوم ہوتے ہیں (کہاوت) اپنے آدمی کے لچھنوں یا گنوں سے سب لوگ با خبر ہوتے ہیں

کہتا تو میں کچھ نہیں پر اے رنگیں ہیں
اپنے بچھڑے کے دانت سب کو معلوم

۱۸۳۵ رنگین (بحوالۂ امیر)

—بچھڑے کے دانت سبھی پہچانتے ہیں
رک: "اپنے بچھڑے کے دانت سب کو معلوم ہوتے ہیں

آپ اس کی فکر نہ کیجیے، اپنے بچھڑے کے دانت سب ہی پہچانتے ہیں۔

۱۸۸۰ فسانۂ آزاد، ۱ : ۱۹۵

—بچھڑے کے دانت کون نہیں جانتا (کہاوت)
رک: "اپنے بچھڑے کے دانت سب کو معلوم ہوتے ہیں"۔

—بس مف۔ ۱۔ اپنے اختیار و مرضی سے

اپنے بس تو باپ دادا کی لکیر چھوڑی نہیں، اب زمانہ ہی موافق نہ ہو تو مجبور ہیں۔

۱۹۲۳ دلی کی چند ہستیاں، ۶۸

۲۔ اپنے امکان و اختیار میں، اپنے قابو میں

۱ . خود بخود ، از خود ، اپنی فطرت یا ذات سے م : یہ مشین اپنے آپ چلتی ہے ۔

۲ . بے بلائے ، بلاترغیب م: میں نے کب بلایا اپنے آپ چلا آیا ۔

۳ . تنہا ، بغیر کسی کی مدد کے

اخلاق محسنی کا ترجمہ لے کر بیٹھا کرو اور اپنے آپ دیکھا کرو ۔

۱۸۷۴ مجالس النسا ، ۳۰

۴ . جان بوجھ کر ، دانستہ م: اپنے آپ کون کنویں میں گرتا ہے ۔

۵ . لازماً ، البتہ م: جو اندھوں کی طرح چلے گا اپنے آپ گرے گا ۔

۶ . دل ہی دل میں ، خود کلامی کے طور پر

آپ اپنے آپ کچھ شکایت آمیز باتیں بھی کر رہے تھے ۔

۱۹۱۴ راج دلاری ، ۱۶

اپنے آپ اس طرح باتیں بھی کرتا جاتا ہے ۔

۱۹۵۹ وہی ، ۱۶

ـــآپ کو کچھ سمجھنا (محاورہ)

۱ . اپنی نسبت بڑائی کے خیالات رکھنا ، اپنے تئیں بڑا لائق تصور کرنا

۲ . نازاں اور مغرور ہونا

ـــآپ کو کھینچنا (محاورہ)

۱ . غرور کرنا ، اکڑنا

نازک بہت ہے رشتۂ الفت نہ ٹوٹ جائے
اتنا نہ اپنے آپ کو اے مہجمال کھینچ

۱۸۷۸ گلزار داغ ، ۸۱

۲ . صحبت سے کترانا ، (کسی سے) اجتناب کرنا

وہ خود بھی اپنے آپ کو کھینچتی ہے ، تمام صحبتوں کو چھوڑ دیا ہے ۔

۱۹۲۶ شرر ، مقدس نازنین ، ۲۹۸

ـــآپ میں رک: **"اپنے آپے میں"**

صاحبو اس کو سودا ہوگیا ہے ، یہ تو اپنے آپ میں نہیں ہے ۔

۱۹۰۰ طلسم خیال سکندری ، ۲ : ۳۰

ـــآپ میں آنا ہوش میں آنا ، حواس میں ہونا

وارفتگئ شوق میں لذت بھی ہے گر
بیخود ہے اپنے آپ میں آیا نہ جائے گا

۱۹۴۰ بیخود ، موہانی ، ک ، ۲۴

ـــآپے سے گزرنا (محاورہ)

۱ . خوشی یا بڑائی کے احساس سے مست ہوجانا ، جامے سے باہر ہونا ، حداعتدال سے بڑھنا

شادمانی میں گزرتے اپنے آپے سے نہیں
غم میں رہتے ہیں شگفتہ شادمانوں کی طرح

۱۸۹۳ د ، حالی ، ۷۵

جب سمانا ہے ترا اس میں غرور
اپنے آپے سے گزر جانا ہے داغ

۱۹۰۵ داغ ، محاورات داغ ، ۱۵

۲ . بیخود ہونا ، اپنی ہستی کو بھول جانا

ہوش میں جب آسماں آتے ہیں ہم
اپنے آپے سے گزر جاتے ہیں ہم

۱۹۰۵ دیوان انجم ، ۸۸

ـــآپے سے نکل جانا (محاورہ) رک: **"اپنے آپے**

سے گزر جانا" (۲)

جب نکلنے نہیں دیتے ہیں مجھے زنداں سے
اپنے آپے سے میں ناچار نکل جاتا ہوں

۱۸۷۰ الماس درخشاں ، مہر ، ۱۵۲

—آپے میں مف. ہوش میں، باحواس

میں اپنے آپے ہی میں نہ تھا تو میری حالت کیا پوچھتے ہو۔

۱۹۲۴ حاجی بابا ، ۲۱٦

میں عشق کی بدولت اپنے آپے میں نہ تھا۔

۱۹۲۸ اودھ پنچ ، ۱۳ : ۷ ، ۱۰

—آگے مف . ۱ . اپنے مقابلے میں

عشق کے باعث گنے جاتے ہیں نادانوں میں ہم
ورنہ گنتے اپنے آگے کس کو دانائی میں تھے

۱۸۴۹ ک، ظفر ، ۲ : ۱۷۹

۲ . آئندہ، مستقبل میں رک: "اپنے آگے پائیے"

—آگے پائے (عو) رک : "اپنے اللہ سے پائے"

تو نہ مانے بھاڑ میں جائے خدا کرے اپنے آگے پائے۔

۱۹۰۱ راقم ، عقد ثریا ، ٦۸

—باپ کا (بیٹا) ہے (کہاوت) ۱ . اپنے باپ کی سیرت یا خصائل و شمائل کا حامل ہے

۲ . اپنے باپ کے نقش قدم پر چل رہا ہے، وہی کر رہا ہے جو اس کا باپ کرتا تھا

—باپ کا نہیں (محاورہ)

۱ . کسی کی رو رعایت نہیں کرتا

۲ . شرم و حیا سے عاری ہے

—بالوں روئیے دوسرے کے بالوں ہنسیے (کہاوت)

دنیا کے لوگ اپنے نقصان کا افسوس کرتے اور دوسرے کے نقصان کی ہنسی آڑاتے ہیں۔

—بچے کو ایسا ماروں جو پڑوسن کی چھاتی پھٹے (کہاوت) خود کو ایسی تکلیف پہنچاؤں کہ حریف بھی دیکھنے کی تاب نہ لاسکے

—بچھڑے کے دانت سب کو معلوم ہوتے ہیں (کہاوت) اپنے آدمی کے لچھنوں یا گنوں سے سب لوگ با خبر ہوتے ہیں

کہتا تو میں کچھ نہیں پر اے رنگیں ہیں
اپنے بچھڑے کے دانت سب کو معلوم

۱۸۳۵ رنگین (بحوالہ امیر)

—بچھڑے کے دانت سبھی پہچانتے ہیں

رک: "اپنے بچھڑے کے دانت سب کو معلوم ہوتے ہیں

آپ اس کی فکر نہ کیجیے، اپنے بچھڑے کے دانت سب ہی پہچانتے ہیں۔

۱۸۸۰ فسانہ آزاد ، ۱ : ۱۹۵

—بچھڑے کے دانت کون نہیں جانتا (کہاوت)

رک: "اپنے بچھڑے کے دانت سب کو معلوم ہوتے ہیں"۔

—بس مف . ۱ . اپنے اختیار و مرضی سے

اپنے بس تو باپ دادا کی لکیر چھوڑی نہیں، اب زمانہ ہی موافق نہ ہو تو مجبور ہیں۔

۱۹۲۳ دلی کی چند ہستیاں ، ٦۸

۲ . اپنے امکان و اختیار میں، اپنے قابو میں